بغیر اجازت
سعادت حسن منٹو

بغیر اجازت

سعادت حسن منٹو

بغیر اجازت

سعادت حسن منٹو

پبلشرز

گوشۂ ادب دہلی

فہرست

کرشن چندر

سعادت حسن منٹو

میں شام کے وقت ۶ بجے کے قریب دفتر سے لوٹ کر اپنے مکان کے باہر ٹہل رہا تھا کہ ایک لمبے دبلے تڑچے گورے گورے سے آئے۔ ایک چرمی بیگ بغل میں دبائے اور میری طرف دیکھکر مسکرانے لگے ہم دونوں نے یکایک ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

تم کرشن چندر ہو؟ نووارد نے کہا۔

منٹو! میں نے جواب دیا۔ اور ہم دونوں بغل گیر ہوئے۔

منٹو ایک لمبا سا کوٹ پہنے آیا تھا۔ کمرے کے اندر جاکر منٹو نے کوٹ اتار دیا اور چرمی بیگ کو صوفے پر ٹیک دیا۔ اور خود ایک کرسی پر پاؤں سکیڑ کر اس طرح بیٹھ گیا۔ جس طرح کنہیا لال جیب کترے کا پارٹ ادا کرتے وقت بیٹھتا ہے، مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کہا۔ لو سگریٹ پیو۔

کوئی گھٹیا سگریٹ تھا جو میں نے اسے پیش کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ منٹو بولا۔

ارے یہ سگریٹ پیتے ہو؟ حیرت ہے کہ ایسے سگریٹ پی کر تم اتنے، اور اچھے افسانے کیسے لکھ لیتے ہو؟ یہ سگریٹ پی کر تم صرف دفتر کی کلرکی کر سکتے ہو۔ سمجھے ہو کرشن چندر ایم۔ اے۔ لو اب یہ سگریٹ پیو۔ ۵۵۵ اور بھول جاؤ ان سگرٹوں کو۔"

نوکر نے گرم گرم پھلکیاں پلیٹ میں سجا کر بھیجدیں، میں نے کہا، یہ پھلکیاں گھی میں تلی گئی تھیں۔ خالص گھی پنجاب سے آیا ہے۔

پھلکیاں اور گھی میں؟ منٹو چلایا، لاحول ولاقوۃ، ارے میاں تم تو نرے کودن ہو۔ ارے بھائی میرے کون بیوقوف پھلکیاں گھی میں تلتا ہے؟ اس سے تو پھلکیوں کا مزہ ہی بدل جاتا ہے، تلنے کے لئے گھی نہیں ڈالڈا بہتر ہے، ڈالڈا سے بہتر فرائی اور کوئی نہیں ہوتا، میری بیوی کو آنے دو، پھر میں تمہیں پھلکیاں کھلاؤں گا چٹپٹی اور کرکری اور ایسی مزیدار جیسے بمبئی کی کھاٹن ہوتی ہے، کبھی بمبئی گئے ہو؟

میں نے کہا۔ میں تو پہلی بار دہلی آیا ہوں اس سے آگے دنیا کیسی ہے معلوم نہیں بمبئی چلو اور چھوڑو یہ ریڈیو ویڈیو۔ لو شراب پیو۔

یہ کہہ کر منٹو نے اپنے چھوٹے کوٹ کی ایک جیب سے بوتل نکالی۔
سولن وسکی بمبر ۱ اور اس کا کارک اڑا کر بولا۔ لو جلدی سے لو۔ گلاس
منگاؤ دیر ہو رہی ہے۔

اب تک میں نے شراب نہ چکھی تھی، لیکن منٹو کا چہرہ اس قدر درست
تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر تند تھا کہ میں نے سوچا، اگر میں نے انکار کیا،
تو کہیں وہ مجھے مار ہی نہ بیٹھے۔ میں نے نہائیت اطمینان سے دو گلاس
منگوائے، منٹو نے شراب انڈیلنی شروع کی، پوچھنے لگا تم کون سی
شراب پیتے ہو؟

میں نے کہا برانڈی یا پھر ——— کوئی اچھی سی وہسکی۔

"کونسی انگریزی وہسکی"؟ منٹو نے تلخی سے کہا، وسکی انگریزی
نہیں ہوتی، سکاچ ہوتی ہے۔ سالے انگریز شراب تک تو کشید نہیں کر سکتے
ہندوستان پر حکومت کیا کریں گے۔

میرے ذہن میں ایک انگریزی۔ سکاچ وہسکی کا اشتہار آ گیا۔

(DONT BE YAGHE ASK FOR HAOUE)

میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ہیگ بہت پسند ہے

سب بکواس ہے، منٹو بولا۔ سولن وہسکی نمبر ۱ سب سے بہتر ہے۔
آئندہ سے ہیگ مت پیا کرو۔ صرف سولن وہسکی نمبر ۱ سمجھے!

میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ آئندہ سے ہینگ نہیں پیئوں گا

اور ڈالوں؟ منٹو نے میرے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو قریباً ایک چوتھائی بھر چکا تھا۔

میں نے کہا۔ اور نہیں۔ جیسے تمہاری مرضی۔ اور ڈال دو۔

"تو کیا پٹیالہ پیگ پیو گے؟"

منٹو نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے کہا ہاں۔ دراصل مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ پٹیالہ پیگ کیا ہوتا ہے؟ ہاں کہہ دینے سے نجات مل گئی

"بڑے بیباک ہو" منٹو نے مجھے شبہے کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا ——

میں تو پہلے پیگ ہی میں نہال ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا میں نے نہیں لیا۔ اور نہ منٹو نے اصرار کیا، کیونکہ وہ میری حالت دیکھ چکا تھا۔ میں نے اقبال کیا کہ پہلی بار شراب پی رہا ہوں، اس پر منٹو نے شراب کے فائدے گنائے۔

گناہ کی لذت شراب میں ہے مکروہات دُنیا سے نجات شراب میں ہے۔ بھئی تم کب تک پنڈت بنے رہوگے؟ آخر تمہیں ادب کی تخلیق کرنا ہے۔ کوئی سکول کے بچوں کو تو پڑھانا ہے نہیں، زندگی نہیں دیکھو گے؟ گناہ نہیں کروگے، موت کے قریب نہیں جاؤ گے؟ غم کا مزہ نہیں چکھو گے؟

سولن وہسکی نہیں پیوگے تو کیا خاک لکھوگے ؟"

بوتل ختم کرنے کے بعد وہ بھی آؤٹ ہوگیا۔ اب اس کا تقاضا یہی تھا۔ کہ

میں کرشن چندر ایم۔ اے کیوں ہوں؟ صرف کرشن چندر کیوں نہیں؟

پھر مجھے چڑانے کے لئے بار بار کہنے لگا۔ "کرشن چندر ایم۔ اے،

کرشن چندر ایم۔ اے"

اور میں نے بدلا چکانے کی خاطر اس سے کہا۔ تم یہ بتاؤ۔ تم کون ہو؟

منٹو ہو۔ یا منٹو ہو۔ یہ منٹو کیا ہے۔ منٹو، منٹو، منٹو، منٹو! وہ کہنے لگا۔

"کرشن چندر ایم۔ اے۔ کرشن چندر ایم۔ اے کرشن چندر ایم۔ اے"

تھوڑی دیر تک اسی طرح گردان کرتے ہوئے ہم دونوں سو گئے۔ میں

صوفے پر۔ اور وہ اسی کرسی پر اسی طرح سو گیا۔ گردن ٹانگوں میں دبائے

ہوئے اور صبح تک اسی طرح سو رہا تھا، میز پر بوتل اوندھے منہ پڑی

تھی۔ گلاس خالی تھے اور پھلکیاں باسی تھیں۔ میں نے منٹو کو جگایا۔ اٹھو!

وہ اٹھتے ہی کہنے لگا۔ اگر اس وقت بھی تھوری سی مل جائے تو

شراب کا ذائقہ زبان سے دور ہو جائے، تم جانتے ہو شراب کے ذائقے کو

دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ صبح اٹھتے ہی آدمی شراب کے دو گھونٹ پھر

پی لے۔ سمجھے۔ شراب منگاؤ۔ پھر مجھے آل انڈیا ریڈیو جانا ہے۔

وہ کیوں! میں نے پوچھا!

میں یہاں ڈرامے لکھنے کے لئے بلایا گیا ہوں۔"

"گولی مارو بمبئی کو اور یہ بکواس بند کرو۔ اور شراب منگاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا چرمی بیگ کھولا۔ اور ایک افسانہ نکال کر مجھے دیا۔ "اسے ذرا پڑھ لو۔ میں اپنے افسانے کسی کو نہیں دکھاتا ہوں، اپنے باپ کو بھی نہیں۔ بس صرف تمہیں دکھاتا ہوں، گو تم بھی افسانے بہت اچھے نہیں لکھتے، مگر ایک بات ہے ان میں اسے مانتا ہوں ——— سمجھے کرشن چندر ایم اے

منٹو کی باتوں میں مزاح انوکھاپن ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی موضوع پر اس سے گفتگو کیجئے وہ اس پر ایک نئے انداز سے پوچھے گا۔ عام راستوں سے بچ کر چلنے کی عادت اب اس کے مزاج کا خاصا بن گئی ہے۔ وہ اسے ترک نہیں کرسکتا۔ آپ اگر سولن وسکی کی تعریف کریں تو وہ سمرسٹ ماہم کے گن گائے گا۔ آپ بمبئی شہر کی خوبیاں گنائیں گے۔ تو وہ امرتسر کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔ آپ جناح یا گاندھی کی تعریف کریں گے تو وہ اپنے محلے کے موچی ——— کی عظیم ہستی کا معترف ہوگا۔ آپ گوشت اور پالک پسند فرمائینگے، تو وہ آپ کو دال کھانے کی ترغیب دیگا۔ آپ شادی کرنا چاہیں گے تو وہ آپ کو کنوارہ رہنے کے لئے مصر ہوگا۔ آپ کنوارپنے کو بہتر سمجھیں گے۔ تو وہ شادی کی افادی حیثیت سے بحث کرکے آپ کو شادی کے لئے مجبور کریگا۔ تو آپ اس کے احسان کی تعریف کرینگے تو وہ آپ کو برا بھلا کہے گا۔ آپ اس کو گالی دیں گے تو وہ آپ کے لئے پانچ سو روپے کی نوکری ڈھونڈتا پھرے گا۔

منٹو کے مزاج کی طرح اس کی دوستی دشمنی اور اس کا انتقام بھی عجیب ہے اور اس میں بیچی

بشریت کے بہت سے پہلو پائے جاتے ہیں اس کی درشتی، بیباکی اور تلخی ایک قسم کا خول

ہے، جو اس نے اپنی نرم شخصیت کے تحفظ کی خاطر اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے، اپنے آپ

کو دوسروں سے مطلقاً مختلف دکھانے کی خواہش کرے گا دراصل اس کے سوا اور

اور کچھ نہیں کہ وہ اندر سے بالکل ہمارے ایسا ہے، بلکہ ہم سے زیادہ زخمی ہے زیادہ

جذباتی ہے، زیادہ ہمدرد ہے، منٹو کو لوگوں نے اکثر ہنستے ہوئے۔ شراب پیتے

ہوئے اپنے احباب کا مذاق اُڑاتے ہوئے، تسلیم شدہ حقیقتوں اور سچائیوں کو طنزیہ

انداز میں جھٹلاتے ہوئے دیکھا ہے لیکن میں نے منٹو کو روتے ہوئے بھی دیکھا ہے

وہ اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی موت پر رو رہا تھا، جس وقت مجھے خبر ملی میں

جلدی سے دوڑا دوڑا اس کے گھر گیا، منٹو نے اس طرح اپنی لال لال آنکھوں سے

مجھے گھور کر دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو "اور تم اب آئے ہو، جبکہ وہ مر چکا ہے جبکہ ہم

اسے دفنانے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے آتے تو شاید میرا بچہ بچ جاتا۔

اس کا گلا رندھا ہوا تھا اور اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور اس نے مجھ

سے کہا:۔

کرشن! میں موت سے نہیں ڈرتا، کسی کی موت سے نہیں متاثر ہوتا، لیکن یہ بچہ اس لئے نہیں

کہتا ہوں کہ یہ میرا بچہ ہے، اس لئے کہتا ہوں تم اسے دیکھتے ہوتا؟ اس وقت بھی کتنا معصوم،

کتنا نیا، کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے سوچتا ہوں کہ:۔

جب کوئی نیا خیال اپنے اختتام تک پہنچنے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے اس وقت کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ ہر نیا بچہ ایک نیا خیال ہے۔ یہ کیوں ٹوٹ گیا ابھی میں نے اس کی جانکنی دیکھی ہے میں مر جاؤں تم مر جاؤ۔ بڈھے، جوان، ادھیڑ عمر کے لوگ، مر جائیں، مرتے رہیں لیکن ——— یہ بچہ فطرت کو کسی نئے خیال کو اتنی جلدی نہ توڑنا چاہیئے۔ اور ——— پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے قنوطی خول کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

منٹو کے افسانے اس کے مزاج اور اس کے ماحول کے آئینہ دار ہیں، منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے، ان میں کہیں جھول نہیں آتا۔ کہیں کچے ٹانکے نہیں ہوتے، بخیہ عمدہ ہوتا ہے، استری شدہ صاف ستھرے افسانے زبان سنجی ہوئی، بے لیس، سادہ، ہاں اس کے ارمانوں کے رنگ عجیب ہوتے ہیں، ان کی تراش نرالی ہوتی ہے، اس کے استعارے چھوٹے ہوتے ہیں ان میں رس، شعریت اور شفقی اوصاف نہیں ہوتا۔ وہ ادب میں حسن نہیں، اقلیدس کا قائل ہے، ہر چیز ٹھی تُلی رکھتا ہے وہ اپنے استعاروں کے مفہوم، تاثر اور حدود اربعہ سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اور لاشعوری حسن سے انہیں، ایک متعین ترتیب اور جومیٹری کی اشکال سے تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے اور اکثر رومانیت پسندوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہتا ہے۔

منٹو زمین کے بہت قریب ہے اس قدر قریب کہ اکثر گھاس کے خوشے میں رینگنے والے کیڑے بھی اپنے تمام اوصاف کیساتھ اسے نظر آتے ہیں۔ اور جو لوگ زندگی کو ایک اوپری پھسلتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ منٹو کے عمیق مشاہدے اور اس کی ژرف نگاہی کی داد دینے سے قاصر رہتے ہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کہیں کہیں حد سے بڑھی ہوئی انا اسے دھوکا دیجاتی ہے یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ گھاس کے
کیڑوں اور آسمان میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے درمیان زندگی اور ادب کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اور انفرادی
اختیار کر لیتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اس کی بیشتر تخلیقات عظیم بشریت کے نصب العین پر پوری
اُترتی ہیں اور اپنی سادگی اور سچائی اور تلخی کے اندر ایک ایسے شیریں حسن کی نمو رکھتی ہیں جس کے حصول کے لئے
انسان کا سینہ آج تک ترس رہا ہے ۔

میں نے اس کا افسانہ لالٹین پڑھا تو مجھے اس کا بیشتر حصہ اس کے سوانح سے متعلق معلوم ہوا اسکی
جزیات میں جو حزن و ملال جھلکتا ہے، وہ خود رومانی منٹو کی زندگی کا حصہ معلوم ہوتا ہے اسکے لیے گویا اسکے
افسانوں سے کسی نے ساری نرمی، ملائمت اور مٹھاس چھین لی ہے یا شاید اس نے ان اوصاف کو اپنی کہانیوں سے دھکے
مار کر نکال دیا ہو، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اذیت کوش جذبے کے زیر اثر ایسا کر رہا تھا،
نکلو، نکلو زندگی بہت تلخ ہے ان میں ان جذبات کا گزر نہیں، بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ اس
کے اکثر افسانوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ان جذبات کو دیدہ دانستہ دھکے مار کر باہر نکال
رہا ہو، کبھی بچوں کی طرح بسورنے لگتا ہے، کبھی تلخ لہجے میں، نہایت ہی خوشگوار لہجے میں ان کا مذاق
اُڑاتا رہتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اس تلخی، زہرناکی اور طنزیہ ہنسی کے پیچھے کتنی نرمی ملائمت
اور زندگی کی چاہت چھپی ہوئی ہے، ایسی چاہت جسکی بھوک ابدی ہے اور کبھی نہ مٹتی منٹو ازل سے
بھوکا ہے اس کے ہر افسانے میں محبت کی پکار ہے۔ آپ اس کے انداز پر نہ جائیے، وہ ہزار بار کہتا ہے مجھے
انسانوں سے محبت نہیں ہے میں ایک گلے سڑے کتے کے پلے سے محبت کر لونگا، مگر انسانوں سے نہیں وہ
کہیگا مجھے دوستی، عنایت، شفقت کسی پر اعتبار نہیں، میرا اعتقاد شراب ہے، یہ ترقی پسندی سب بکواس

ہے۔ میں ترقی پسند نہیں ہوں، میں منٹو ہوں، اور شاید وہ بھی نہیں ہوں، وہ یہ سب باتیں کہتا ہے۔ تکلفاً کبھی آپکا جی جلانے کیلئے، آپکو دھوکہ دینے کیلئے بھی وہ یہ سب باتیں کہتا ہے لیکن اسکی آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں اس کا قلم کچھ اور کہتا ہے اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کی زبان کی طرح اس کا قلم اسکے قابو میں نہیں ہے، وہ اپنی انسانی ہمدردی، اپنی ترقی پسندی، اپنی بشری محبت پر پردہ ڈالنے کی ہزار کوشش کرتا ہے، اپنے افسانوں پر یہ زہر کا روغن چڑھاتا ہے، لیکن اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے اور ہر افسانے کے پس پردہ انسانی محبت اُبلی پڑتی ہے۔

منٹو نے زندگی کے شاہیے میں اپنے آپ کو ایک موم کی شمع کی طرح پگھلایا ہے وہ اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس کے ذائقے کو، اسکے رنگ کو گھول گھول کر بیان کیا ہے، لوگ بدکتے ہیں، ڈرتے ہیں، مگر اس کے مشاہدے کی حقیقت اور اس کے ادراک کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ زہر کھانے سے اگر شنکر کا گلا نیلا ہو گیا تھا، تو منٹو نے بھی اپنی صحت گنوائی ہے۔ اس کی زندگی انجکشنوں کی محتاج ہو کے رہ گئی تھی، یہ زہر منٹو ہی پی سکتا تھا اور کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا دماغ چل جاتا۔ مگر منٹو کے دماغ نے زہر کو بھی ہضم کر لیا۔ ان درویشوں کی طرح جو پہلے گانجے سے شروع کرتے ہیں۔ اور آخر میں سنکھیا کھانے لگتے ہیں اور سانپوں سے اپنی زبان ڈسوانے لگتے ہیں۔

منٹو کے ادب کی تیزی و تندی اور اس کی زبان کی نشتر زنی اس امر کی آئینہ داری کرتی ہے کہ منٹو کا فقر آخری منزل پر پہنچ چکا ہے۔

آہ منٹو

سونے کی انگوٹھی
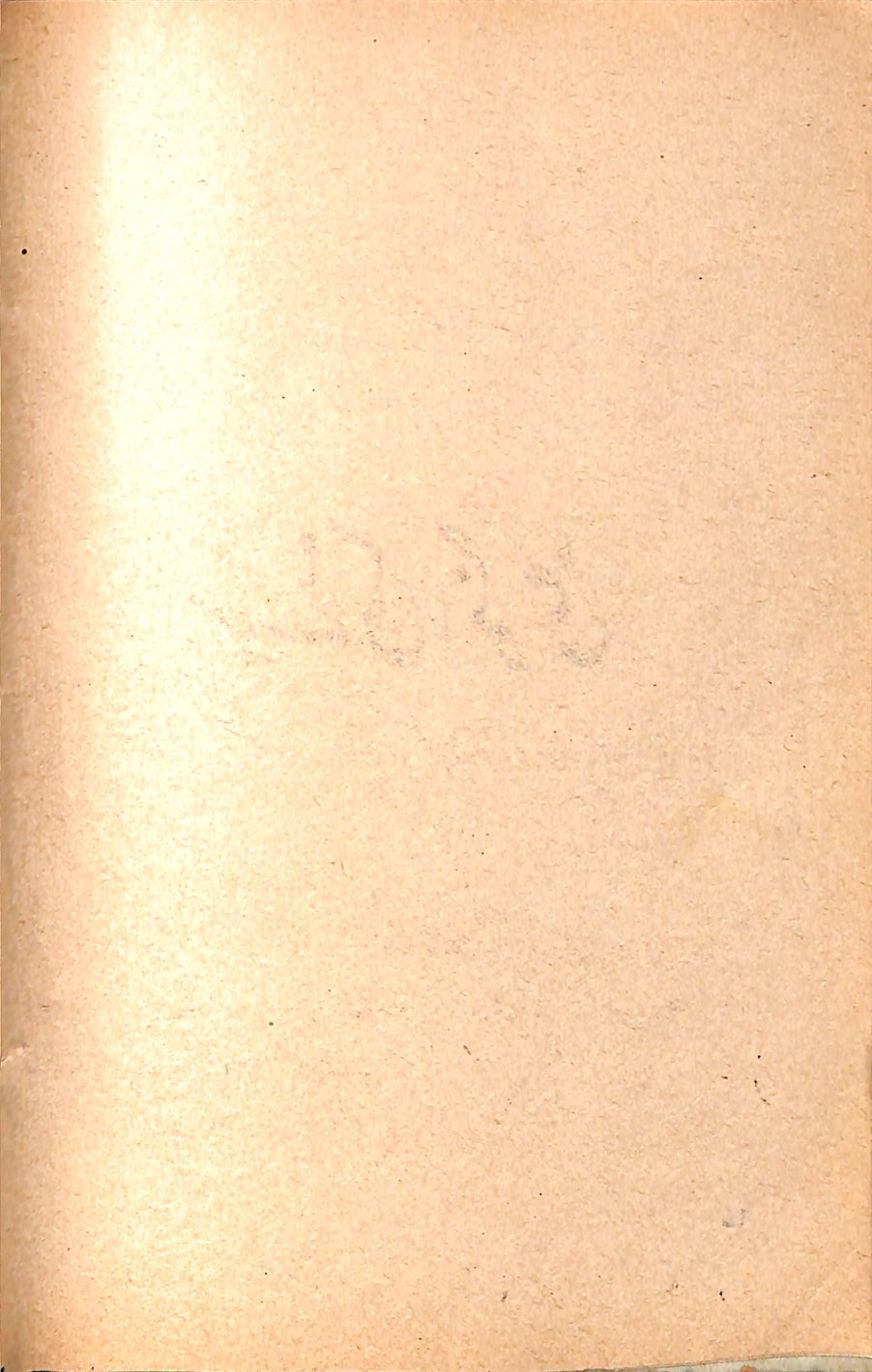
چھتّے کا چھتّا ہو گیا ہے آپ کے سر پہ ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
بال نہ کٹوانا کہاں کا فیشن ہے!"
"فیشن ویشن کچھ نہیں ــــ نہیں اگر بال کٹوانے پڑیں تو قدرِ عافیت
معلوم ہو جائے!"
"میں کیوں بال کٹواؤں!"
"کیا عورتیں کٹواتی نہیں؟ ــــ ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسی موجود ہیں جو
اپنے بال کٹواتی ہیں ــــ بلکہ اب تو یہ فیشن بھی چل نکلا ہے کہ عورتیں مردوں
کی طرح چھوٹے چھوٹے بال رکھتی ہیں!"
"لعنت ہے اُن پر!"

"کس کی؟"

"خدا کی اور کس کی؟ ـــــ بال تو عورت کی زینت ہیں ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں کیوں اپنے بال مردوں کے مانند منوالیتی ہیں ـــــ پھر تپلونیں پہنتی ہیں ـــــ نہ رہے ان کا وجود دنیا کے اس تختے پر۔"

"وجود تو خیر آپ کی اس بد عا سے ان نیک عورتوں کا دنیا کے اس تختے سے کسی حالت میں بھی غائب نہیں ہوگا ـــــ ویسے ایک چیز سے مجھے تم سے کلّی اتفاق ہے کہ عورت کو تپلون جسے سلیکس کہتے ہیں نہیں پہنتی چاہیئے ـــــ اور سگریٹ بھی نہیں پینے چاہئیں۔"

"اور آپ ہیں کہ دن میں پورا ایک ڈبہ پھونک ڈالتے ہیں۔"

"اس لئے کہ میں مرد ہوں ـــــ مجھے اس کی اجازت ہے۔"

"کس نے دی تھی یہ اجازت آپ کو؟ ـــــ میں اب آئندہ سے ہر روز صرف ایک ڈبیا منگا کر دیا کروں گی۔"

"اور وہ جو تمہاری سہیلیاں آتی ہیں ان کو سگریٹ کہاں سے ملیں گے۔"

"وہ کب پیتی ہیں؟"

"اتنا سفید جھوٹ نہ بولا کرو ـــــ ان میں سے جب بھی کوئی آتی ہے، تم میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر اندر لے جاتی ہو ـــــ ساتھ ہی ماچس بھی ـــــ آخر مجھے آواز دے کر تمہیں بلانا پڑتا ہے اور میرا ڈبہ مجھے واپس

مل جاتا ہے۔ اس میں سے پانچ چھ سگریٹ غائب ہوتے ہیں۔"

"پانچ چھ سگریٹ؟ ــــــ جھوٹ تو آپ بول رہے ہیں ــــــ وہ بیچاریاں تو مشکل سے ایک سگریٹ پیتی ہیں۔"

"ایک سگریٹ پینے میں اُنہیں مشکل کیا محسوس ہوتی ہے؟"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی؟ ــــــ آپ کو تو اور کوئی کام ہی نہیں سوائے بحث کرنے کے۔"

"ہزاروں کام ہیں ــــــ تم کون سے ہل چلاتی ہو ــــــ سارا دن پڑی سوئی رہتی ہو۔"

"جی ہاں ــــــ آپ تو چوبیس گھنٹے جاگتے اور وظیفہ کرتے رہتے ہیں۔"

"وظیفے کی بات غلط ہے ــــــ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں صرف رات کو چھ گھنٹے سوتا ہوں۔"

"اور دن کو؟"

"کبھی نہیں ــــــ بس آنکھیں بند کر کے تین چار گھنٹے لیٹا رہتا ہوں کہ اس سے آدمی کو بہت آرام ملتا ہے ــــــ ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔"

"یہ تھکن کہاں سے پیدا ہوتی ہے ــــــ آپ کون سی مزدوری،

کرتے ہیں؟"

"مزدوری ہی تو کرتا ہوں ——— صبح سویرے اُٹھتا ہوں ———
اخبار پڑھتا ہوں ——— ایک نہیں، چھ ——— پھر ناشتہ کرتا ہوں ———
نہاتا ہوں اور پھر تمہاری روزمرہ کی ٹیں ٹیں کے لئے تیار ہو جاتا ہوں ———"

"یہ مزدوری ہوئی؟ ——— اور آپ یہ تو بتائے کہ روزمرہ کی ٹیں ٹیں کا الزام
کہاں تک درست ہے؟"

"جہاں تک اُسے ہونا چاہئیے ——— شروع شروع میں ——— میرا
مطلب شادی کے بعد دو برس تک بڑے سکون میں زندگی گذرتی رہی تھی، لیکن پھر
ایک دم تم پر کوئی ایسا دورہ پڑا کہ تم نے ہر روز مجھ سے لڑنا جھگڑنا اپنا معمول
بنا لیا ——— پتہ نہیں اس کی وجہ کیا ہے"؟

"وجہ ہی تو مردوں کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے ——— آپ لوگ
سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے"

"مگر تم سمجھنے کی مہلت بھی دو ——— ہر روز کسی نہ کسی بات کا شوشہ
چھوڑ دیتی ہو ——— بھلا آج کیا بات تھی۔ جس پر تم نے اتنا چیخنا چلانا شروع
کر دیا؟"

"گویا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ آپ نے پچھلے چھ مہینوں سے بال نہیں کٹوائے۔
اپنی اچکنوں کے کالر دیکھئے ——— میلے چکٹ ہو رہے ہیں ———"

"ڈرائی کلین کرالوں گا۔"

"پہلے اپنا ڈرائی کلین کرائیے ——— وحشت ہوتی ہے اللہ قسم آپ کے بالوں کو دیکھکر ——— جی چاہتا ہے مٹی کا تیل ڈال کر ان کو آگ لگا دوں۔"

"تاکہ میرا خاتمہ ہی ہو جائے ——— لیکن مجھے تمہاری اس خواہش پر کوئی اعتراض نہیں ——— لاؤ باورچی خانے سے مٹی کے تیل کی بوتل ——— آہستہ آہستہ میرے سر میں ڈالو، اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کو آگ دکھا دو ——— خس کم جہاں پاک۔"

"یہ کام آپ خود ہی کیجئے ——— میں نے آگ لگائی تو آپ یقیناً کہیں گے کہ تمہیں کسی کام کا سلیقہ نہیں۔"

"یہ تو حقیقت ہے کہ تمہیں کس بات کا سلیقہ ہے۔ کھانا پکانا نہیں جانتیں سینا پرونا تمہیں نہیں آتا ——— گھر کی صفائی بھی تم اچھی طرح نہیں کر سکتیں ——— بچوں کی پرورش ہے اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے ———"

"جی ہاں، بچوں کی پرورش تو اب تک ماشاء اللہ آپ ہی کرتے آئے ہیں ——— میں تو بالکل نکمی ہوں۔"

"میں اس معاملے میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا ——— تم خدا کے لئے اس بحث کو بند کرو۔"

"میں بحث کہاں کر رہی ہوں —— آپ تو معمولی باتوں کو بحث کا نام دے دیتے ہیں۔"

"تمہارے نزدیک یہ معمولی باتیں ہوں گی، مگر خدا کی قسم! تم نے میرا دماغ چاٹ لیا ہے —— میرے سر پہ ہمیشہ اتنے ہی بال رہے ہیں —— اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اِتنی فرصت نصیب نہیں ہوتی کہ حجام کے پاس جاؤں ——"

"جی ہاں —— آپ کو اپنی عیاشیوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔"

"کن عیاشیوں سے؟"

"آپ کام کیا کرتے ہیں؟ —— کہاں ملازم ہیں —— کیا تنخواہ پاتے ہیں۔"

"ملازمت کیا ضروری ہے؟ —— میں تو اس کو بہت بڑی لعنت سمجھتی ہوں۔"

"آپ کو تو وہ ہر کام بہت بڑی لعنت معلوم ہوتا ہے، جس میں آپ کو محنت مشقت کرنی پڑے۔"

"میں کیا محنت مشقت نہیں کرتا؟ —— ابھی پچھلے دنوں ہنڈیں سپلائی کرنے کا میں نے جو ٹھیکہ لیا تھا، جانتی نہیں ہو میں نے دن رات ایک کر دیا تھا۔"

"گدھے کام کر رہے تھے، آپ تو سوتے رہے ہوں گے۔"

"گدھوں کا زمانہ گیا ـــــ لاریاں کام کر رہی تھیں ـــــ اور مجھے اُن کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ دس کروڑ اینٹوں کا ٹھیکہ تھا ـــــ مجھے ساری رات جاگنا پڑتا تھا۔"

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ آپ ایک رات بھی جاگ سکیں۔"

"اب اس کا کیا علاج ہے کہ تم نے میرے متعلق ایسی غلط رائے قائم کر لی ہے ـــــ اور میں جانتا ہوں کہ تم ہزار ثبوت دینے پر بھی مجھ پر یقین نہیں کرو گی۔"

"میرا یقین آپ پر سے عرصہ ہوا۔ اُٹھ گیا ہے ـــــ آپ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔"

"بہتان تراشی میں تمہاری ہم پلہ اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی ـــــ میں نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا ـــــ۔"

"ٹھہریئے ـــــ پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی دوست کے ہاں گئے تھے، لیکن شام کو جب آپ نے تھوڑی سی پی، تو چہک چہک کر مجھے بتایا کہ آپ ایک ایکٹرس سے مل کر آ رہے ہیں۔"

"وہ ایکٹرس بھی تو اپنی دوست ہے ـــــ دشمن تو نہیں ـــــ میرا مطلب ہے اپنے ایک دوست کی بیوی ہے۔"

"آپ کے دوستوں کی بیویاں عموماً یا تو ایکٹرسیں ہوتی ہیں، یا طوائفیں"۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے"؟

"قصور تو سارا میرا ہی ہے"۔

"وہ کیسے"؟

"ایسے کہ میں نے آپ سے شادی کرلی ——— میں ایکٹرس ہوں نہ طوائف"۔

"مجھے ایکٹرسوں اور طوائفوں سے سخت نفرت ہے ——— مجھے اُن سے کوئی دلچسپی نہیں ——— وہ عورتیں نہیں سلیٹیں ہیں، جن پر کوئی بھی چند حروف یا لمبی چوڑی عبارت لکھ کر مٹا سکتا ہے ———"

"تو اُس روز آپ کیوں اُس ایکٹرس کے پاس گئے"۔

"میرے دوست نے بلایا ——— میں چلا گیا ——— اُس نے ایک ایکٹرس سے جو پہلے چار شادیاں کرچکی تھی، نیا نیا بیاہ رچایا تھا۔ مجھے اُس سے متعارف کرایا گیا ———"

"کیسی تھی"؟

"چار شادیوں کے بعد بھی وہ خاصی جوان دکھائی دیتی تھی ——— بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ عام کنواری جوان لڑکیوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اچھی تھی"۔

"یہ ایکٹرسیں کس طرح خود کو چست اور جوان رکھتی ہیں؟"

"مجھے اس کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں ـــــــ بس اتنا سنا ہے کہ وہ اپنے جسم اور جان کی حفاظت کرتی ہیں۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ بڑی بدکردار ہوتی ہیں ـــــــ اوّل درجے کی فاحشہ۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے ـــــــ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔"

"آپ ایسی باتوں کا جواب ہمیشہ گول کر جایا کرتے ہیں۔"

"جب مجھے کسی خاص چیز کے متعلق کچھ علم ہی نہ ہو تو میں جواب کیا دوں ـــــــ میں تمہارے مزاج کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔"

"دیکھئے آپ میرے متعلق کچھ نہ کہا کیجئے ـــــــ آپ ہمیشہ میری بے عزتی کرتے رہتے ہیں ـــــــ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"میں نے تمہاری بے عزتی کب کی ہے؟"

"یہ بے عزتی نہیں کہ پندرہ برسوں میں آپ میرا مزاج نہیں جان سکے ـــــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں مخبوط الحواس ہوں۔ نیم پاگل ہوں، جاہل ہوں، اُجڈ ہوں۔"

"یہ تو خیر تم نہیں ہو ـــــــ لیکن تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے ـــــــ

ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے میرے بالوں کی بات کس غرض سے شروع کی

—— اس لئے کہ جب بھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو، تو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے۔"

"خاص بات کیا ہوگی —— بس آپ سے صرف یہی کہنا تھا۔ کہ بال اتنے بڑھ گئے ہیں کٹوا دیجئے —— حجام کی دکان یہاں سے کتنی دور ہے —— زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہوگی —— جائیے —— میں پانی گرم کراتی ہوں۔"

"جاتا ہوں —— ذرا ایک سگریٹ پی لوں۔"

"سگریٹ وگریٹ آپ نہیں پئیں گے —— صبح سے اب تک —— ٹھہریئے میں ڈبہ دیکھ لوں —— میرے اللہ —— بیس سگریٹ پھونک چکے ہیں آپ —— بیس!"

"یہ تو کچھ زیادہ نہ ہوئے —— بارہ بجنے والے ہیں!"

"زیادہ باتیں مت کیجئے —— سیدھے حجام کے پاس جایئے —— اور یہ اپنے سر کا بوجھ اُتروائیے۔"

"جاتا ہوں —— کوئی اور کام ہو تو بتا دو۔"

"میرا کوئی کام نہیں —— آپ اس بہانے سے مجھے ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا، تو میں چلا"

"ٹھہریئے"

"ٹھہر گیا۔ فرمایئے"

"آپ کے بٹوے میں کتنے روپے ہوں گے"؟

"پانچ سو کے قریب"

"تو یوں کیجئے ــــــ بال کٹوانے سے پہلے انار کلی سے سونے کی ایک انگوٹھی لے آیئے ــــــ آج میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے ــــــ دو ڈھائی سو روپے کی ہو"

"میری تو ہیں، انار کلی ہی میں حجامت ہو جائے گی ــــــ جاتا ہوں"

---*---
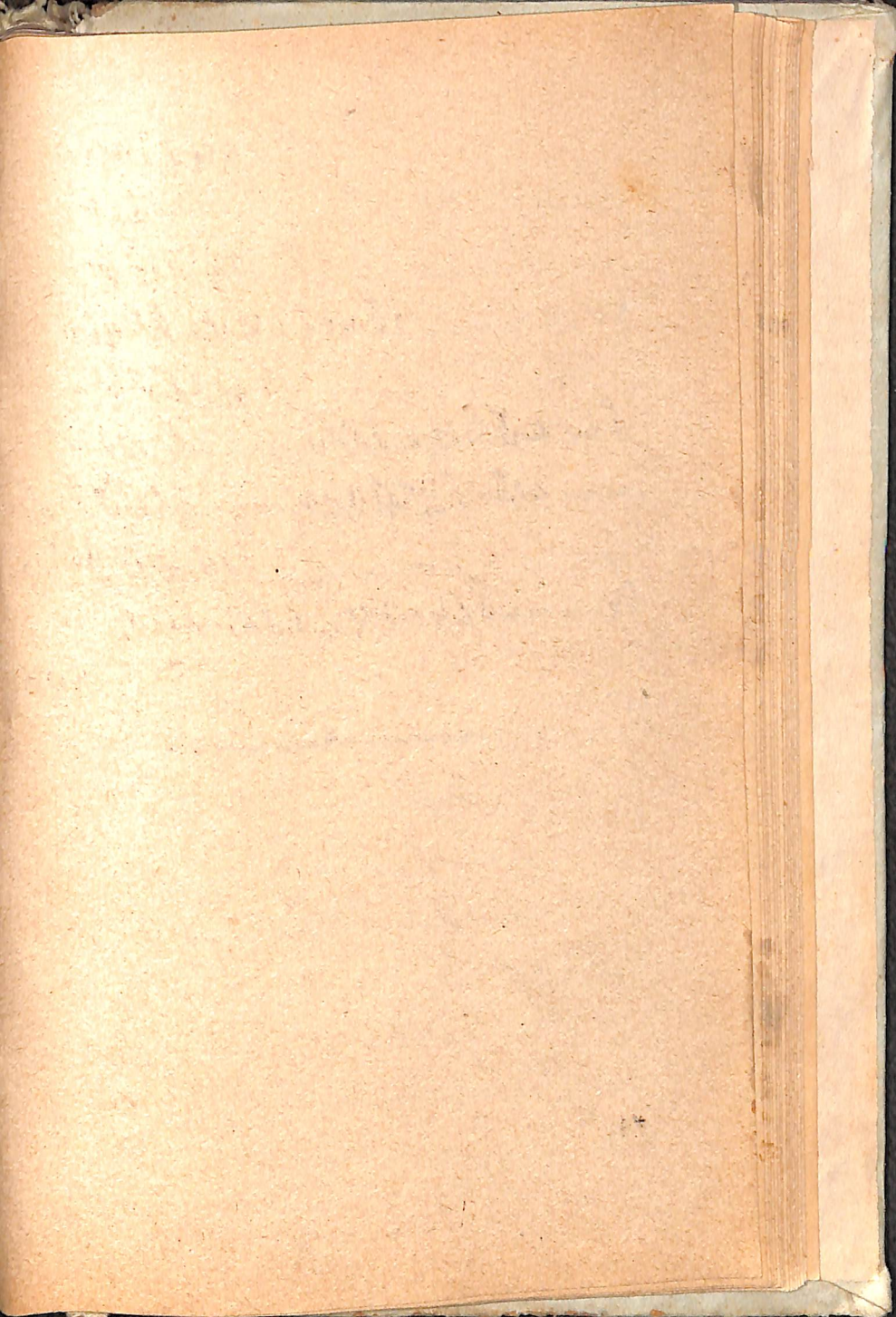
ٹانگے والے کا بھائی
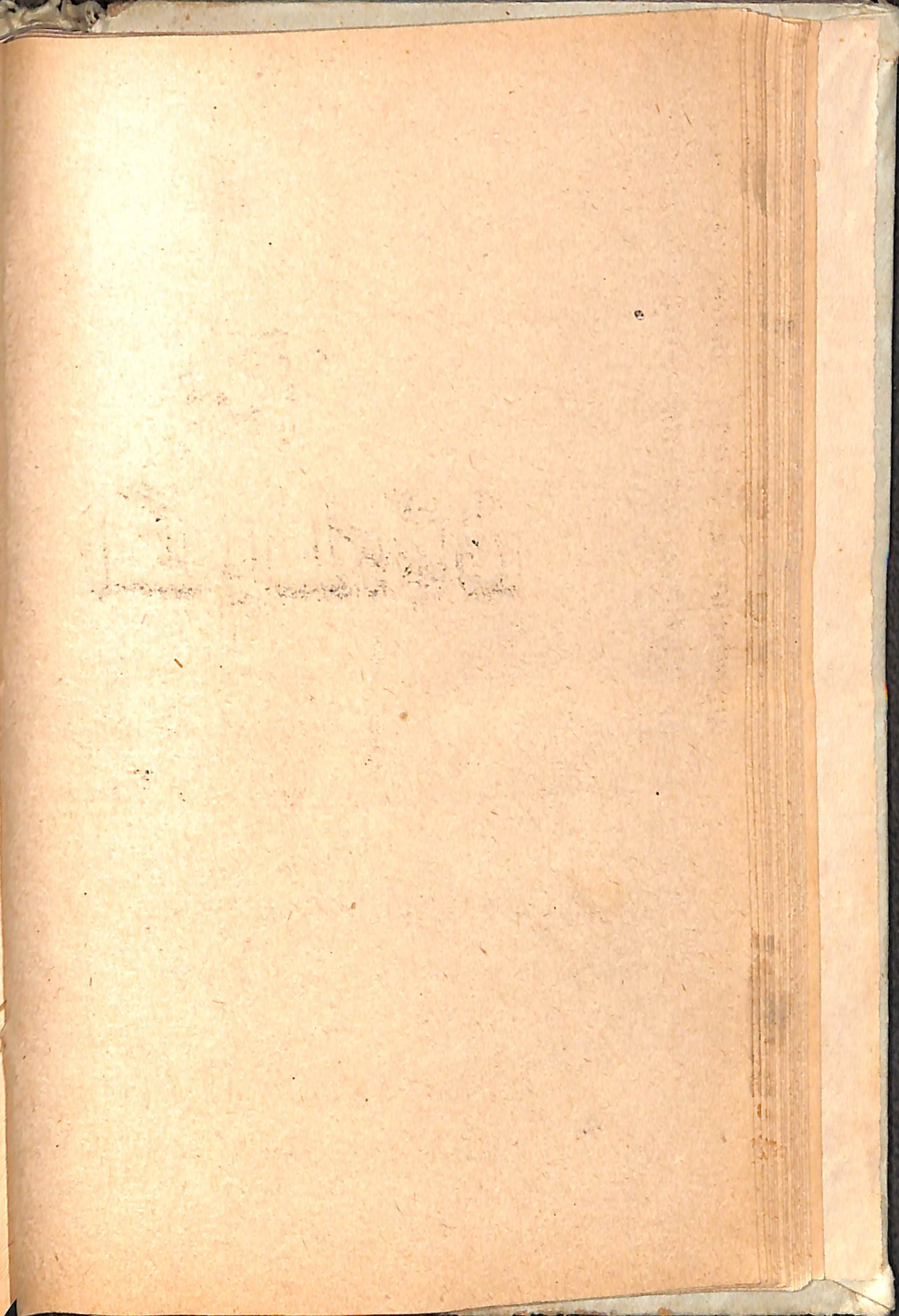
سید غلام مرتضےٰ جیلانی میرے دوست ہیں۔ میرے ہاں اکثر آتے ہیں۔ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ کافی پڑھے لکھے ہیں۔

اُن سے میں نے ایک روز کہا "شاہ صاحب! آپ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ تو سنایئے"

شاہ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا "منٹو صاحب ——— میری زندگی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے ——— کون سا واقعہ آپ کو سناؤں؟

میں نے اُن سے کہا "جو بھی آپ کے ذہن میں آجائے"

شاہ صاحب مسکرائے "آپ مجھے بڑا پرہیزگار آدمی سمجھتے ہوں گے ———

آپ کو معلوم نہیں میں نے دس برس تک دن رات شراب پی ہے ــــ ا
خوب کھُل کھیلا ہوں۔ اب چونکہ دل اُچاٹ ہو گیا ہے، اس لئے میں نے یہ شغل
چھوڑ رکھے ہیں"

میں نے پوچھا "کہیں آپ نے شادی تو نہیں کر لی"

"حضرت میں پانچ برس سے لاہور میں ہوں۔ اگر میں نے شادی کی ہوتی
تو آپ کو اس کی اطلاع مل جاتی"

"تو کیا آپ ابھی تک کنوارے ہیں"؟

"جی ہاں"

"بڑے تعجب کی بات ہے"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری "چلئے ــــ آپ کو ایک داستان سُنا
دوں ــــ آپ اسے لکھ کر اپنے پیسے کھرے کر لیجئے گا"

مجھے پیسے کھرے کرنے تو تھے، پھر بھی میں نے اُن سے کہا۔ نہیں
شاہ صاحب ــــ آپ اپنی داستان سنائیے۔ دیکھئے اس کا افسانہ
بنتا بھی ہے یا کہ نہیں ــــ ویسے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں
کہ اگر میں نے آپ کی اس داستان کو افسانے میں ڈھال لیا، تو مجھے جو معاوضہ
ملے گا، سب کا سب آپ کا ہو گا"

شاہ صاحب ہنسے "چھوڑو یار ــــ میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے

ٹکڑوں کی قیمت وصول نہیں کرنا چاہتا ــــــــ تم افسانہ نگار لوگ عجیب ڈھب کے ہوتے ہو ــــ داستان سُن لو ــــــ باقی تم جانو ــــــ مجھے معاوضے وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔"

شاہ صاحب کے لب و لہجے سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اُنہیں میری بات پسند نہیں آئی۔اس لئے میں نے اس کے بارے میں مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی اور اُن سے کہا۔"آپ اپنی داستان بیان کرنا شروع کر دیں۔"

شاہ صاحب نے میرے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سُلگایا۔مجھے بڑا تعجب ہوا۔اس لئے کہ میں نے انہیں چار پانچ برس کے عرصے میں کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اُن سے کہا شاہ صاحب آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

شاہ صاحب کے ہونٹوں پر جن میں سگریٹ اٹکا ہوا تھا عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔"منٹو صاحب! آپ نے اپنی زندگی میں اتنے سگریٹ نہیں پیے ہوں گے، جتنے میں پی چکا ہوں ــــــ اور اتنی شراب بھی آپ نے ابھی تک نہیں پی ہو گی جتنی کہ میں پی چکا ہوں ــــــ آج آپ نے ایسی بات چھیڑ دی کہ خود بخود میرے ہاتھ آپ کے سگریٹ کیس کی طرف اُٹھ گئے ــــــ وسکی ہے آپ کے پاس؟"

میں نے جواب دیا۔"جی ہاں ــــــ ہے۔"

"تو لاؤ ـــــ ایک پٹیالہ پگ ـــــ میں دس برس کا رکھا ہوا روز
توڑوں گا ـــــ تم نے آج ایسی باتیں کی ہیں کہ میرا سارا جسم ماضی میں
چلا گیا ہے"

میں نے اپنی الماری سے وسکی کی بوتل نکالی اور شاہ صاحب کے لئے
ایک پٹیالہ پگ بنا کر حاضر کر دیا۔ انہوں نے ایک ہی جرعے میں گلاس خالی کر دیا
آستین سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "ہاں تو اب
کہانی سنو ـــــ لیکن یہ بوتل یہاں سے غائب کر دو"

میں نے وسکی کی بوتل اٹھائی اور اندر جا کر الماری میں رکھ دی۔ واپس
آیا تو دیکھا شاہ صاحب دوسرا سگریٹ سلگا رہے ہیں۔

میں کرسی اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ مسکرائے ـــــ لیکن
یہ مسکراہٹ کچھ زخمی سی تھی۔ انہوں نے اسی زخمی مسکراہٹ سے کہنا شروع کیا
"جو واقعہ میں اب بیان کرنے والا ہوں۔ آج سے قریب قریب دس برس پہلے
کا ہے ـــــ ہمارا حلقۂ احباب زیادہ تر کھانے پینے اور کافی مالدار
ہندوؤں کا تھا ـــــ بڑے اچھے لوگ تھے ـــــ ہر روز پینے پلانے کا شغل
رہتا ـــــ اس حلقے میں مجھ سے علاوہ کئی اور دوستوں کو شراب کے
علاوہ عورت کی بھی ضرورت محسوس ہوا کرتی ـــــ وہ کسی نہ کسی طرح
اپنی ضرورت پوری کر لیا کرتے۔ مجھ سے کہتے کہ تم بھی آؤ ـــــ مگر میں

انکار کر دیتا ——— اپنی مرضی کے خلاف ——— میرا دل ویسے چاہتا تھا کسی عورت کی قربت نصیب ہو۔"

میں نے شاہ صاحب سے کہا: "آپ نے شادی کیوں نہ کر لی۔"

شاہ صاحب نے جواب دیا: "میں نے ——— سچ پوچھو تو اس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

"کیوں؟"

"بس کبھی خیال ہی نہ آیا۔"

"خیر ——— آپ اپنی داستان جاری رکھئے۔"

شاہ صاحب نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں دبایا۔ "پیارے منٹو، میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کے سوا کسی اور شغل میں نہ پھنسوں۔ لیکن ان کم بختوں نے آخر ایک دن مجھے آمادہ کر ہی لیا ——— یہ طے پایا کہ اسی دلال کے ذریعے سے خوش شکل لونڈیا منگوائی جائے ——— ہم اور دوست فلیٹ سے باہر نکلے تو ایک ٹانگے والا جو کہ میرا واقف تھا ——— مجھے دیکھ کر پکار اٹھا: "شاہ جی ——— شاہ جی ——— آؤ ——— آؤ ——— چاروں دوست اس کے ٹانگے میں بیٹھ گئے ——— اس وقت میں پورا پورا مدہوش ہو چکا تھا کہ شراب کے ساتھ عورت ضرور ہونی چاہیئے ——— چنانچہ میں نے اپنی ساری شرافت اپنی جیب میں ڈال کے اس کے کان میں کہا کہ وہ

کسی لونڈیا کا بندوبست کر دے ـــــ جب اُس نے یہ سُنا تو وہ بھونچکا
سا ہو کے رہ گیا۔ اُس کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں کبھی ایسی واہیات بات کروں گ
لیکن جب میں نے اس کے کان میں پھر کہا کہ مجھے واقعی ایک لڑکی کی اشد ضرورت
ہے تو اُس نے بڑے ادب سے کہا "شاہ جی! نسیں جو حکم دیو ـــــ بندہ
حاضر اے ـــــ ایسی کراری کُڑی لے کے آواں گا کہ ساری عمر یاد
رکھو گے"

ٹانگے والا چلا گیا اور ہم واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ شام کا وقت تھ
جب وہ یہ مہم سر کرنے کے لئے گیا تھا۔ ہم دیر تک انتظار کرتے رہے۔ طرح
طرح کے خیالات میرے دل میں آتے تھے۔ وہ کراری لڑکی کس قسم کی ہو گی
کہیں کوئی بازاری عورت تو نہ نکل آئے گی

ہم جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو تاش کھیلنا شروع کر دی۔
رات کے بارہ بج گئے۔ ہم مایوس ہو کر باہر نکلے تو دیکھا کہ ٹانگے والا گھوڑے سے
کے چابک لگاتا چلا آ رہا ہے۔ پچھلی نشست پر ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی تھی۔ میر
دل دھک دھک کرنے لگا۔

ٹانگے والے نے مجھ سے کہا "شاہ جی جو مال میں لینے گیا تھا وہ دسا و
چلا گیا ہے ـــــ اب یہ دوسرا مال بڑی کوششوں سے ڈھونڈ کر لایا ہو
ـــــ میں نے اس کو پانچ روپے دئے۔ پھر ہم چاروں دوست سوچنے

لگے کہ اس برقعہ پوش عورت کو کہاں لے جائیں۔ اپنے فلیٹ میں لے جانا ٹھیک نہیں تھا، اس لئے کہ محلے داری تھی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔ بات کا بتنگڑا بن جاتا۔ خواہ مخواہ ایک فضیحتا ہو جاتا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے دوست رحمان کے پاس چلتے ہیں جو اکیلا رہتا ہے۔

رات کے ایک بجے کے قریب ہم اُس بُرقعہ پوش عورت کے ہمراہ رحمان کے مکان پر پہنچے۔ بہت دیر تک دستک دینے کے بعد اُس نے دروازہ کھولا۔ کمبل اوڑھے تھا۔ اُسے غالباً بخار تھا۔

میں نے اس کو ساری بات دبی زبان میں بتائی تو اُس نے بھی دبی زبان ہی میں کہا "شاہ جی ——— آپ کو کیا ہو گیا ہے ——— میرا مکان حاضر ہے۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس مہینے کی بیس تاریخ کو میری شادی ہونے والی ہے ——— میرا سالا اندر ہے ——— اس کی موجودگی میں یہ سلسلہ جو آپ چاہتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے"۔

کچھ دیر ——— میری سمجھ میں نہ آیا اُس سے کیا کہوں ——— لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اُس کو ڈانٹا "یار تم نرے کھرپے بیوقوف ہو ——— اپنے سالے کو چلتا کرو ——— ہم اتنی دور سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ کیا تم میں اتنی مروت بھی باقی نہیں رہی۔ بیس تاریخ کو تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے ——— لیکن آج

میری شادی ہے ——— یہ میری دُلہن برقعہ پہنے ٹانگے میں بیٹھی ہے ——— تمہیں اپنے دوستوں کا کچھ تو خیال ہونا چاہیئے۔"

رحمان کو میری حالت پر کچھ ترس آگیا، چنانچہ اُس نے اپنے سالے کو جگایا اور اُس کو اپنے بخار کے لئے کوئی ضروری دوا لینے کے لئے باہر بھیج دیا۔ شہر میں قریب قریب کیمسٹوں کی سب دکانیں بند تھیں۔ لیکن اُس نے اپنے سالے سے کہا "وہ سارے شہر کی دکانیں دیکھو۔ جہاں سے بھی تمہیں یہ دوا ملے لے کر آؤ۔"

لڑکا برخوردار قسم کا نھا نسخہ لے کر آنکھیں ملتا چلا گیا۔ اس غریب کو ٹانگہ بھی شاید نظر نہ آیا، جس میں برقعہ پوش عورت بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا کہ ہجوم ٹھیک نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں میرے دوست کیا حرکتیں کریں۔ چنانچہ میں نے اُن کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ ٹانگے میں واپس چلے جائیں۔ پانچ روپے میں نے ٹانگے والے کو اور دے دیئے مگر اس نے بُرقعہ پوش سواری اتاری تو کہا حضور ——— اس کی فیس تو دیتے جایئے ———"

میں نے پوچھا "کتنی ہے"؟

"پچیس روپے"

میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور گِن کر پانچ پانچ کے پانچ نوٹ

اُس کے حوالے کر دے۔ اور اُس برقعہ پوش عورت کو اپنے دوست کے مکان میں لے آیا۔

رحمان کو بخار تھا۔ وہ علیحدہ کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ میں بہت دیر تک اس برقعہ پوش عورت سے گفتگو کرتا رہا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ اپنے چہرے سے نقاب ہی ہٹایا

میں تنگ آ گیا۔ اُس کو ٹٹولا تو وہ بالکل سپاٹ تھی۔ آخر میں نے زبردستی اُس کا برقعہ اُلٹ دیا ــــــ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی! جب دیکھا کہ وہ عورت نہیں ــــــ ہیجڑہ تھا ــــــ نہایت مکروہ قسم کا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے اُس سے پوچھا "یہ کیا واہیات پن ہے"؟

اس ہیجڑے نے جس کے چہرے پر بالوں کا نیلا نیلا غبار موجود تھا۔ بڑے نسوانی انداز میں جواب دیا۔ "میں ــــــ میں ٹانگے والے کا بھائی ہوں"۔

شاہ صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب اُس دن کے بعد مجھے اس سلسلے سے کوئی رغبت نہیں رہی"۔

——————*——————

مسز حمیدہ
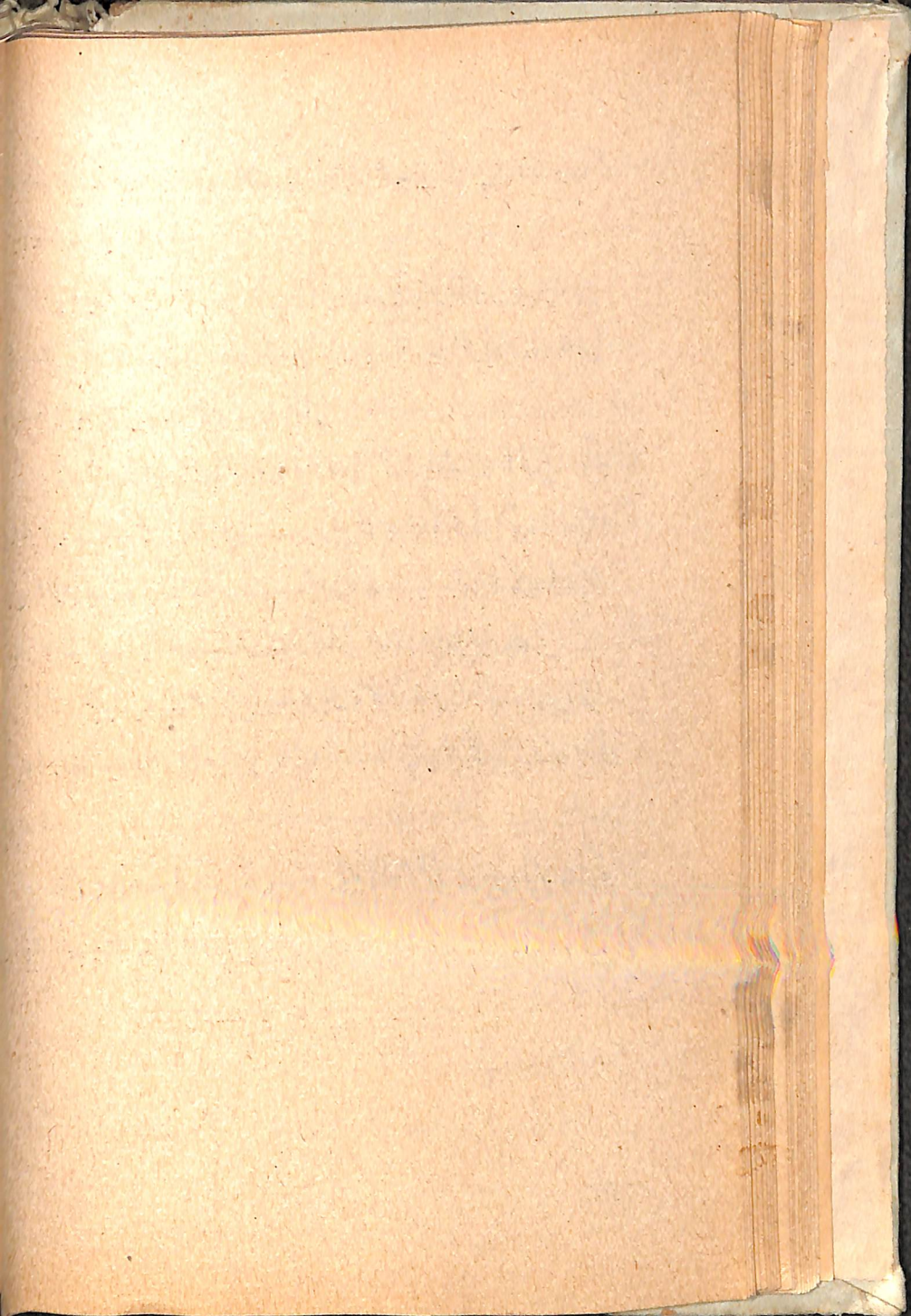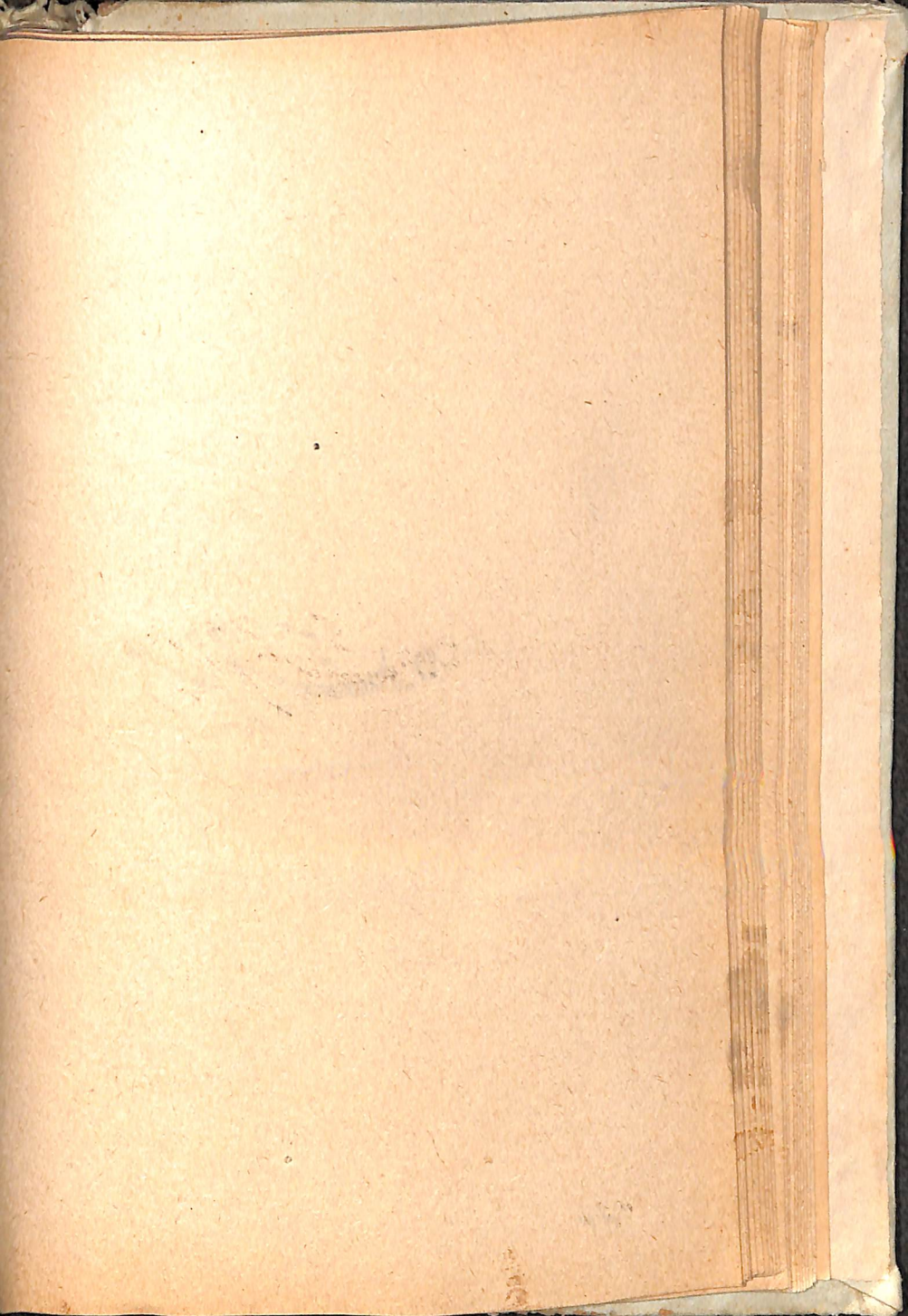
رشید نے پہلی مرتبہ اس کو بس اسٹینڈ پر دیکھا، جہاں وہ شیڈ کے نیچے کھڑی
بس کا انتظار کر رہی تھی رشید نے جب اُسے دیکھا تو وہ ایک لحظے کے لئے
حیرت میں گم ہو گیا۔ اس سے قبل اُس نے ایسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی، جس کے
چہرے پر مردوں کی مانند ڈاڑھی اور مونچھیں ہوں۔

پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اُس کی نگاہوں نے غلطی کی ہے، عورت
کے چہرے پر بال کیسے اُگ سکتے ہیں۔ پر جب اُس نے غور سے دیکھا تو
اُس لڑکی نے باقاعدہ شیو کر رکھی تھی، اور مٹمیئی غبار اُس کے گالوں اور
ہونٹوں پر موجود تھا۔

رشید نے سمجھا کہ شاید ہیجڑہ ہو، مگر نہیں، وہ ہیجڑہ نہیں تھی۔ اس لئے کہ

اس میں ہیجڑوں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے، وہ مکمل عورت
تھی، ناک نقشہ بہت اچھا تھا، کولہے چوڑے چکلے —— کمر پتلی ——
سینہ جوانی سے بھرپور —— بازو سڈول —— غرضیکہ اُس کے جسم
کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ نمونہ تھا۔
ایک صرف اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا ——
رشید سوچنے لگا قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان، خوبصورت
لڑکی کو بدنما بنا دیا۔

رشید کے دماغ میں کئی خیال اوپر تلے آئے اور وہ بوکھلا سا گیا۔
وہ سوچتا تھا "کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی؟"
"صبح اُٹھ کر جب اسے اُسترہ پکڑ کر شیو کرنا پڑتی ہو گی، تو اسے کیا محسوس
ہوتا ہو گا؟ —— کیا اس وقت اُس کے جی میں جھنجلا کر یہ انتقامی خواہش
پیدا نہ ہوتی ہو گی کہ وہ گھس کھدے کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے؟"
"ایک عورت کے لئے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خارپشت کی مانند اُس کے گالوں
پر دوسرے روز نوکیلے بال اُگ آئیں؟"
"اگر مردوں کے مانند عورتوں کے بھی ڈاڑھی مونچھ اُگتی، تو کوئی حرج نہیں
تھا —— پر یہاں ازل سے عورتیں ان بالوں سے بے نیاز رہی
ہیں ——"

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں، عورتوں کے چہرے پر بالوں کا ہونا کوئی معیوب چیز نہیں ——— لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ یہ دیکھنے کے عادی نہیں۔"

"صنفِ نازک آخر صنفِ نازک ہے ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جوہر موجود ہیں ——— پر یہ ڈاڑھی مونچھ کس لئے اُگ آئی ہے ——— نظر ٹُو کے طور پر؟ ——— اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیئے ——— بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈا بنا دینا ——— یہ کہاں کی شرافت ہے۔"

"اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا، جو ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر اُسترہ ہاتھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو؟"

"اگر یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور انہیں بڑھا لے ——— تو کیا اس سے خوف نہیں آئے گا ——— آپ بے ہوش نہ ہوں، لیکن چند لمحات کے لئے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے ——— آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے ——— جہاں مونچھیں مُنڈی ہوں گی، مگر آپ کی صنفِ مقابل اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہو گی۔"

بس آگئی، وہ لڑکی اس میں سوار ہو کر چلی گئی۔ رشید کو بھی اسی بس سے جانا تھا، لیکن وہ اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھا کہ اُس کو بس کی آمد کا پتہ چلا، نہ اُس

کے جانے لگا۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اُس لڑکی کو ایک نظر اور دیکھنے کے لئے پلٹا
تو وہ موجود نہیں تھی ——— اُس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اُس
نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اُس نے
مزید سوچ وچار شروع کر دی۔

اُس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا ——— بار بار وہ قدرت کی بے انصا
پر لعنتیں بھیجتا تھا، کہ اُس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت
نمونے کو خود ہی بنا کر اُس پر سیاہی کا لیپ کر دیا ——— آخر اس میں کیا
مصلحت تھی؟ ——— اب اس شکل میں اُس سے شادی کون کرے گا؟
——— قدرت نے کیا اُس کے لئے کوئی ایسا مرد پیدا کر رکھا ہے جو اُسے
قبول کر لے گا؟ ——— لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں
ہو سکتی۔

اُس کی بہن آئی، دوپہر ہو چکی تھی۔ اُس نے رشید سے کہا "بھائی
جان چلیئے کھانا کھا لیجئے۔"

رشید نے اُس کی طرف غور سے دیکھا، اور اُس کو یوں محسوس ہوا کہ
اُس کے چہرے پر بھی بال ہیں "سلیمہ ———!"

"جی"

"کچھ نہیں ——— لیکن نہیں، ٹھہرو ——— کیا تمہاری مونچھیں ہیں؟"

سلیمہ جھینپ گئی "جی ہاں ——— بال اُگتے ہیں"

رشید نے اُس سے پوچھا "تو ——— میرا مطلب ہے تمہیں اُلجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے؟"

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا "ہوتی ہے بھائی جان"

"تو انہیں تم کیسے صاف کرتی ہو ——— بلیڈ سے؟"

"جی نہیں ایک چیز ہے جسے لے بی پچ کہتے ہیں ——— اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسانا پڑتا ہے؟"

"تو بال اُڑ جاتے ہیں؟"

"اُڑتے وُڑتے خاک بھی نہیں ——— دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں ——— بڑی مصیبت ہے ——— بعض اوقات تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں"

رشید نے پوچھا "وہ کیوں؟"

سلیمہ نے دردناک لہجے میں جواب دیا "تکلیف ہوتی ہے بہت ——— جب بال اُکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں ——— اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اُمڈ آتا ہے ——— معلوم نہیں، اللہ میاں مجھ سے

کے جانے لگا!"

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اُس لڑکی کو ایک نظر اور دیکھنے کے لئے پلٹا تو وہ موجود نہیں تھی ——— اُس کا ذہن اِس قدر مضطرب تھا کہ اُس نے اپنا کام مُلتوی کر دیا اور گھر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں لبستر پر لیٹ کر اُس نے مزید سوچ وچار شروع کر دی۔

اُس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا ——— بار بار وہ قدرت کی بے انصافی پر لعنتیں بھیجتا تھا، کہ اُس نے کیوں نسوانیت کے اِتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنا کر اُس پر سیاہی کا لیپ کر دیا ——— آخر اس میں کیا مصلحت تھی؟ ——— اب اس شکل میں اُس سے شادی کون کرے گا؟ ——— قدرت نے کیا اُس کے لئے کوئی ایسا مرد پیدا کر رکھا ہے جو اُسے قبول کرلے گا؟ ——— لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اِتنی دُور اندیش نہیں ہو سکتی۔

اُس کی بہن آئی، دوپہر ہو چکی تھی۔ اُس نے رشید سے کہا "بھائی جان چلیئے کھانا کھا لیجئے!"

رشید نے اُس کی طرف غور سے دیکھا، اور اُس کو یوں محسوس ہُوا کہ اُس کے چہرے پر بھی بال ہیں "سلیمہ ———!"

"جی"

"کچھ نہیں —— لیکن نہیں، ٹھہرو —— کیا تمہاری مونچھیں ہیں؟"

سلیمہ جھینپ گئی "جی ہاں —— بال اُگتے ہیں"

رشید نے اُس سے پوچھا "تو —— میرا مطلب ہے تمہیں الجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے؟"

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا "ہوتی ہے بھائی جان"

"تو انہیں تم کیسے صاف کرتی ہو —— بلیڈ سے؟"

"جی نہیں ایک چیز ہے جسے بے بی ٹچ کہتے ہیں —— اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسانا پڑتا ہے"

"تو بال اُڑ جاتے ہیں؟"

"اُڑتے وُڑتے خاک بھی نہیں —— دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں —— بڑی مصیبت ہے —— بعض اوقات تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں"

رشید نے پوچھا "وہ کیوں؟"

سلیمہ نے دردناک لہجے میں جواب دیا "تکلیف ہوتی ہے بہت —— جب بال اُکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں —— اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اُمڈ آتا ہے —— معلوم نہیں، اللہ میاں مجھ سے

کن گناہوں کی سزا لے رہا ہے۔"

رشید نے تھوڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا: "تمہاری کسی اور سہیلی کی بھی ڈاڑھی اور مونچھیں ہیں"؟

"مونچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں، پر ڈاڑھی میں نے کبھی کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھی ——— ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں، جو وہ موچنے، یا ہاتھ سے اُکھاڑ پھینکتی ہیں ——— یہ آپ نے کیسی گفتگو شروع کر دی ——— چلئے، کھانا کھایئے۔"

رشید نے کچھ دیر سوچا: "نہیں ——— میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا ——— میرا معدہ ٹھیک نہیں۔"

رشید کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی بلڈنگ کھائی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی ——— اُس کے سارے جسم پر تیز نوکیلے بال یوں رینگ رہے تھے، جیسے خاردار چیونٹیاں۔

جب سلیمہ چلی گئی، تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا ——— لیکن سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا، اُس لڑکی کے چہرے کے بال تو دُور نہیں ہو سکتے تھے، اس امر کا رشید کو کامل احساس تھا۔ لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمّہ حل کر رہا ہے۔

رشید کو داخلے کی درخواست دینا تھی۔ اُس نے بی۔ اے کا امتحان

راولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور میں کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم، اے کی ڈگری حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلا جائے، جہاں اُس کے والد پریوی کونسل میں پریکٹس کرتے تھے۔

اس روز وہ مُونچھوں اور ڈاڑھی والی لڑکی کے باعث نہ جاسکا۔ دوسرے روز وہ بس کے بجائے ٹانگے میں گیا۔ اُس نے چونکہ بی، اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا تھا۔ اس لئے اُسے داخلے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

وہ ڈاڑھی مونچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو چکی تھی، لیکن ایک دن اُس نے اُس کو کالج میں دیکھا ——— لڑکے اُس کا مذاق اڑا رہے تھے

ایک نے آوازہ کسا "مسٹر حمیدہ!"

دوسرے نے کہا "ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں ——— عورت کی عورت، مرد کا مرد!"

تیسرے نے قہقہہ لگایا "عجائب گھر میں رکھنا چاہیئے تھا ایسی شخصیت کو!"

اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی ——— اس کی پیشانی پسینے سے تر بتر تھی ——— رشید کو اُس پر بہت ترس آیا۔ اُس کے جی میں آئی کہ

آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر پھوڑ ڈالے جو اُس کا مذاق اڑا رہے تھے، مگر وہ کسی مصلحت کی بناء پر خاموش رہا —— جب لڑکے چلے گئے اور اُس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسو خشک کیے، تو وہ جرأت سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملائم لہجے، میں اُس سے مخاطب ہُوا۔ "آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟"

اُس نے تنگ آکر کہا۔ "کیا آپ بھی میرا مذاق اُڑانے آئے ہیں"

رشید نے اپنا لہجہ اور ملائم کر دیا۔ "جی نہیں —— آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجئے"

اُس نے جس کا نام حمیدہ تھا نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا "مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں"

"یہ آپ کی زیادتی ہے —— ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے —— میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں سے اور زیادہ مضطرب کروں —— ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجئے"

یہ کہہ کر رشید چلا گیا

اس کے بعد متعدد مرتبہ اُس نے حمیدہ کو دیکھا، جو بی۔اے میں پڑھتی

تھی، سارے کالج میں اس کی ڈاڑھی مونچھوں کے چرچے تھے ——— لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہوچکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اب یہ محسوس کرنا شروع کردیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بال نہیں ہے۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہوگئی۔ دس پندرہ روز تک اسے بستر میں لیٹنا پڑا۔ رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اس کی بیمار پرسی کے لئے جائے۔ مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہوجائے گی۔ کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہیں تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتی، ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہے، اسے اس کے سوا۔ اور کوئی کھیلنے والا نہ ہو ——— لیکن ایک دن مجبور ہوکر اس نے چپڑاسی کے ہاتھ ایک رقعہ رشید کے نام بھیجا، جس میں صرف یہ چند الفاظ مرقوم تھے۔

رشید صاحب!

میں بیمار ہوں ——— کیا آپ چند لمحات کے لئے میرے کمرے میں تشریف لاسکتے ہیں۔ ممنون ومتشکر ہوں گی۔

حمیدہ

رشید یہ رقعہ ملتے ہی ہوسٹل میں گیا۔ بڑی مشکلوں سے حمیدہ کا کمرہ

تلاش کیا۔ اندر داخل ہوا، تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی،
دنوں سے شیو نہیں کی، کمبل اوڑھے لیٹا ہے، مگر اس نے اپنا ردِ عمل ظاہر
نہ ہونے دیا۔

چارپائی کے ساتھ ہی کرسی پڑی تھی، رشید اس پر بیٹھ گیا۔

حمیدہ مسکرائی "میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے
بخار کے باعث بہت نقاہت ہو گئی ہے۔ اور میں شیو نہیں کر سکی
——— کیا آپ میرے لئے یہ زحمت برداشت کر
سکیں گے"

رشید نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا ——— شیو کا سامان کھڑکی
کی سِل پر موجود تھا۔ کنٹین سے گرم پانی لاکر اس نے حمیدہ کے چہرے
کے بال نرم کئے۔ صابن ملا۔ اچھی طرح جھاگ پیدا کئے اور پانچ منٹ کے
اندر اندر شیو بنا ڈالی ——— پھر تولئے سے اس کا چہرہ خشک کیا
اور شیو کا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں رکھ دیا، جہاں سے اس نے
اٹھایا تھا۔

حمیدہ نے اپنا نحیف ہاتھ گالوں پر پھیرا اور رشید سے کہا،
"شکریہ"

اب دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو گئے۔ رشید نے

ایم۔ اے اور حمیدہ نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ رشید کو فوراً بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔

اب وہ ایک نہیں دو شیو روزانہ بناتا تھا۔

بغیر اجازت

نعیم ٹہلتا ٹہلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔ اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔ گھاس کے ایک تختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی۔
"کیسی پُر فضا جگہ ہے ———— حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے اوجھل رہی ——— نظریں ——— اوجھل ———"
اتنا کہہ کر وہ مسکرایا۔ "نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں ——— آہ کہ نظر کی یہ بے نظری!
دیر تک وہ گھاس کے اس تختے پر لیٹا اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا، لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔ "یہ نرم نرم گھاس کتنی فرحت ناک ہے ——— آنکھیں پاؤں کے تلوؤں میں چلی آئیں ——— اور یہ پھول ———

یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہرجائی خوشبو ہے۔ ہر شے جو ہرجائی ہو خوبصورت ہوتی ہے، ہرجائی عورت، ہرجائی مرد —— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئی تھیں یا خوبصورت خیال —— ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر پھول خوبصورت نہیں ہوتا —— مثال کے طور پر یہ پھول —— اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی " یہ اس ٹہنی پر اکڑوں بیٹھا ہے —— کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے —— بہر حال یہ جگہ خوب ہے۔ ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے —— روشنی بھی ہے۔ سائے بھی ہیں —— ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے —— یہ پُر فضا جگہ جو اتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہی "

اس کے بعد نعیم فرطِ مسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے —— کہ اچانک موٹر کے ہارن کی کرخت آواز اس کے سازِ دل کے سارے تار جھنجوڑ دیتی ہے۔ وہ چونک کر اٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک موٹر پاس کی روش پر کھڑی ہے اور ایک لمبی لمبی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس مونچھوں والے آدمی نے گرج کر کہا " اے، تم کون ہے؟"

نعیم جو اپنے نشے میں سرشار تھا چونکا۔ "یہ موٹر اس باغ میں کہاں سے آگئی ہے؟"

مونچھوں والا جو اس باغ کا مالک تھا بڑبڑایا۔ "وضع قطع سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا ——— کس اطمینان سے لیٹا تھا جیسے اس کے باوا کا باغ ہے۔" پھر اس نے بلند آواز میں للکار کے نعیم سے کہا۔ "اماں، کچھ سنتے ہو۔"

نعیم نے جواب دیا۔ "حضور سن رہا ہوں ——— تشریف لے آیئے یہاں ——— بہت پُر فضا جگہ ہے۔"

باغ کا مالک بھنّا گیا۔ "تشریف کا بچّہ ——— ادھر آؤ۔"

نعیم لیٹ گیا۔ "بھئی مجھ سے نہیں آیا جائے گا تم خود ہی چلے آؤ۔ واللہ بڑی دلفریب جگہ ہے۔ تمہاری سب کوفت دور ہو جائے گی۔"

باغ کا مالک موٹر سے نکلا۔ اور غصے میں بھرا نعیم کے پاس آیا۔

"اٹھو یہاں سے۔"

نعیم کے کانوں کو اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گزری۔ "اتنے اونچے نہ بولو ——— آؤ، یہاں میرے پاس لیٹ جاؤ، بالکل خاموش جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں، آنکھیں بند کر لو، اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو دماغ کی ساری بتیاں گل کر دو۔ پھر جب تم اس اندھیرے میں چلو گے تو ٹٹولتی

ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے قمقمے روشن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل غافل تھے ——— آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔

باغ کے مالک نے ایک لحظ سوچا اور نعیم سے کہا "دیوانے معلوم ہوتے ہو!"

نعیم مسکرایا "نہیں ——— تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں ——— میری جگہ اگر کوئی یہاں دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹہنیوں پر بچوں کے گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا ——— دیوانگی اطمینان کا نام نہیں میرے دوست ——— لیکن آؤ ہم دیوانگی کی باتیں کریں۔

"بکواس بند کرو ——— نکل جاؤ یہاں سے!"

"ارے، تم کون ہو ——— بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو!"

باغ کے مالک کو طیش آگیا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور کہا کہ وہ نعیم کو دھکے مار کر باہر نکال دے۔

جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا، جس پر یہ لکھا تھا:- بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔ وہ مسکرایا "حیرت ہے کہ یہ میری نظروں سے اوجھل رہا ——— نظر ہو تو بعض چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔ آہ، نظر کی یہ بے نظری!"

یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹ کی نمائش میں چلا گیا تاکہ اپنا ذہنی تکدر دور کر سکے۔

ہال میں داخل ہوتے ہی اُس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔

ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا "مسز فوجدار یہ پینٹنگ دیکھی آپ نے؟"

مسز فوجدار نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور اُس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا، کہا "تم نے دیکھا ——— شیریں کتنی سج بن کے آئی ہے"؟

ایک نوجوان عورت ایک نو عمر لڑکی سے کہہ رہی تھی "ثریا اِدھر آ کے تصویریں دیکھ ——— تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟"

ثریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اصل میں اُس کو ایک بوائے فرینڈ سے ملنا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر کا مرد جسے پینٹنگز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اپنے ادھیڑ عمر کے دوست سے کہہ رہا تھا۔ بی بی زکام کی وجہ سے نڈھال ہے۔ ورنہ ضرور آتی ——— آپ جانتے ہی ہیں پینٹنگز سے اُسے کتنی دلچسپی

ہے۔ اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنا لیتی ہے۔ پرسوں اُس نے پنسل
کا غذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر اُتاری ——
میں تو دنگ رہ گیا۔"

نعیم پاس کھڑا تھا۔ اُس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا "ہو بہو سائیکل
معلوم ہوتی ہوگی۔

دونوں دوست بھونچکے سے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بدتمیز ہے، چنانچہ
اُن میں سے ایک نے نعیم سے پوچھا "
آپ کون ہیں؟
نعیم بوکھلا سا گیا "میں —— میں؟
"میں میں کیا کرتے ہو —— بتاؤ تم کون ہو۔"
نعیم نے سنبھل کر کہا "آپ ذرا آرام سے پوچھیے —— میں آپ
کو بتا سکتا ہوں۔"

"تم یہاں آئے کیسے۔"
نعیم کا جواب بڑا مختصر تھا "جی پیدل"
عورتیں اور مرد جو آس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کے بجائے خدا
معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہنسنا شروع کر دیا ——
اتنے میں نمائش کا ناظم آیا۔ اُس کو جب نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو

اُس نے بڑے کڑے انداز میں اُس سے پوچھا "تمہارے پاس کارڈ ہے"؟

نعیم نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا "کارڈ ——— کیسا کارڈ ——— پوسٹ کارڈ"؟

ناظم نے اپنا لہجہ اور کڑا کر کے نعیم سے کہا "بغیر اجازت تم اندر چلے آئے ——— جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے"!

نعیم ایک تصویر کو دیر تک دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اُسے بادلِ ناخواستہ وہاں سے نکلنا پڑا، سیدھا اپنے گھر گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اُس کا نوکر فضلو باہر نکلا۔ نعیم نے اس سے درخواست کی "کیا میں اندر آ سکتا ہوں"؟

فضلو بوکھلا گیا "حضور ——— حضور ——— یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اجازت کیسی۔

نعیم نے اُس سے کہا "نہیں فضلو، یہ میرا گھر نہیں ——— یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے، کیسے میرا ہو سکتا ہے، مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔

فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا "کیا سرکار"؟

نعیم نے کہا "یہی کہ یہ گھر میرا نہیں۔ البتہ اس کا گرد و غبار۔ اسکی تمام غلاظتیں میری ہیں ——— وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت ہوتی ہے میری ہیں

لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی ——
خدا جانے کس کی —— میں اب ڈرتا ہوں۔ کسی اچھی چیز کو اپناتے
خوف لگتا ہے —— یہ پانی میرا نہیں —— یہ ہوا میری نہیں ——
یہ آسمان میرا نہیں —— وہ لحاف جو میں سردیوں میں اوڑھتا ہوں میرا
نہیں —— اس لئے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا ——
فضلو، جاؤ تم بھی میرے نہیں ——"

نعیم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی اور وہ چلا گیا۔

رات کے دس بج چکے تھے —— ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے
سے پایل، ناچ، آوٹ، چین کے بول باہر اڑ اڑ کے آ رہے تھے۔

نعیم اس کوٹھے پر چلا گیا۔ اندر مجرا ہو رہا تھا اس نے دہلیز میں کھڑے
ہو کر بڑے ادب سے اس گانے والی سے پوچھا "کیا میں اندر آ سکتا ہوں"؟

گانے والی نے گانا بند کر دیا اور نعیم سے کہا "آئیے آئیے ——
تشریف لے آئیے اندر —— صاحب آپ اجازت کیوں مانگتے ہیں۔

نعیم اندر داخل ہوا۔ اس نے مجرا سننے والے تین چار مردوں کی طرف
دیکھا اور طوائف سے کہا "ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا"

طوائف مسکرائی "انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے —— ادھر مسند
پہ بیٹھئے —— گاؤ تکیہ لے لیجئے"

نعیم بیٹھ گیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا "یہ کتنی اچھی جگہ ہے"۔

طوائف سنجیدہ ہو گئی "آپ میرا مذاق اڑانے آئے ہیں ——— یہ اچھی جگہ ہے؟ جبکہ تمام شرفا حد سے زیادہ گندی جگہ سمجھتے ہیں ———"

نعیم نے اس سے کہا "یہ اچھی جگہ اس لئے ہے کہ یہاں "بغیر اجازت کے آنا منع ہے" کا بورڈ آویزاں نہیں ہے۔ یہ سن کر طوائف اور اس کا مجرا سننے والے تماشبین ہنسنے لگے ——— نعیم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جس کا مجرا سننے کے لئے اس قسم کے چغد آتے ہیں۔
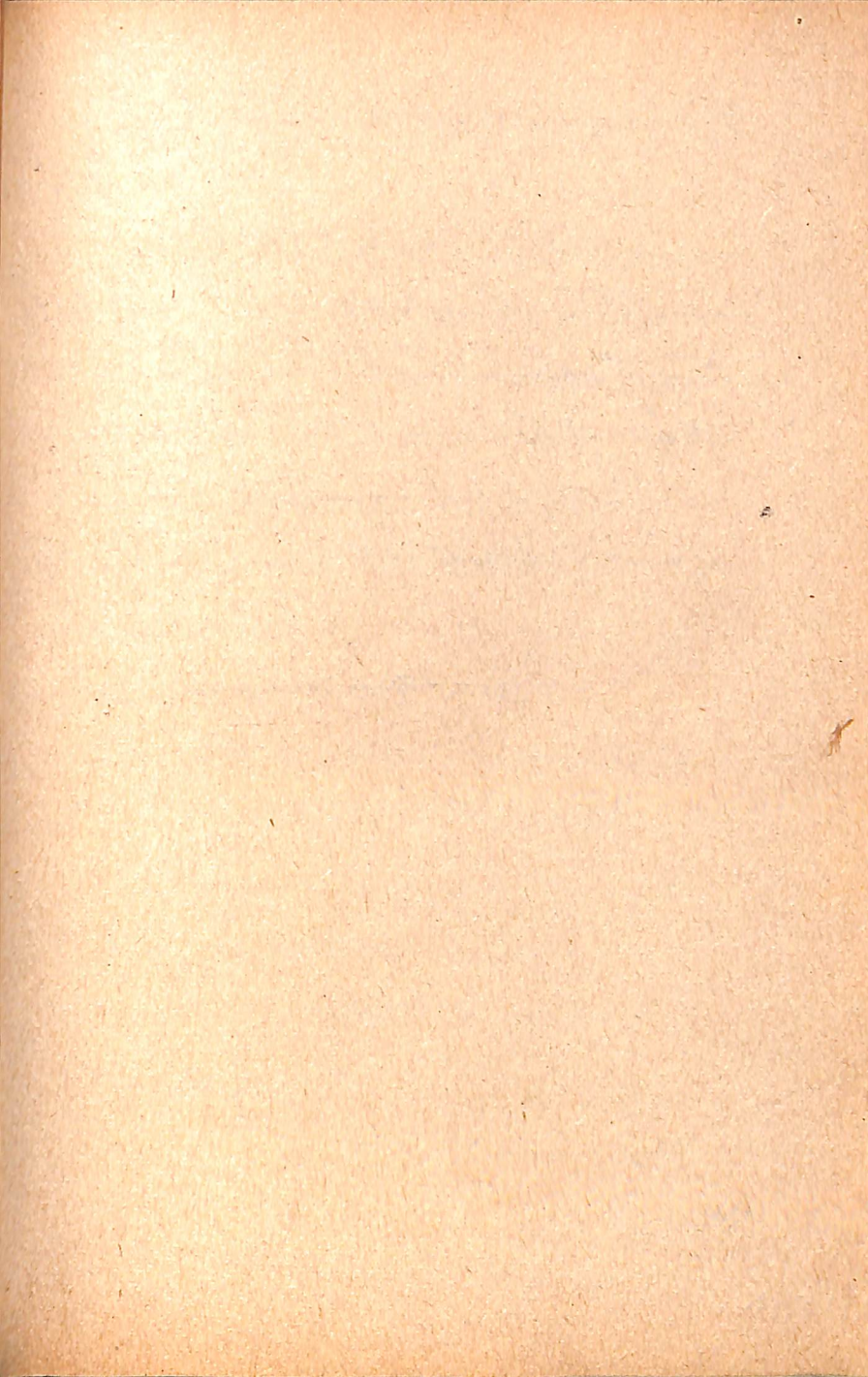
قدرت کا اصول

قدرت کا یہ اصول ہے کہ جس چیز کی مانگ نہ رہے، وہ خودبخود یا تو رفتہ رفتہ بالکل نابود ہو جاتی ہے، یا بہت کم یاب، اگر آپ تھوڑی دیر کیلئے سوچیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں سے کتنی اجناس غائب ہو گئی ہیں۔

اجناس کو چھوڑیے۔ فیشن لے لیجیے۔ کئی آئے اور کئی دفن ہو گئے، معلوم نہیں کہاں ؟۔ دنیا کا یہ چکر بہر صورت اسی طریقے سے چلتا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ لڑکیاں انگیا کا استعمال بہت معیوب سمجھتی تھیں، مگر اب یہ بہت ضروری سمجھا جاتا ہے —— امریکہ اور انگلستان سے طرح طرح کی انگیا آرہی ہیں —— کچھ ایسی ہیں کہ ان میں کوئی اسٹریپ

"نہیں ہوتا۔ ایک انگیا جو سب سے قیمتی ہے، "میڈن فورم" کہلاتی ہے، اسے کوئی بڑھیا بھی پہن لے تو جوان دکھائی دیتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ "شدید" انگیا نورجہاں فلم ایکٹرس نے "چن وے" میں پہنی تھی جوبن کی نمائش سے میرے جمالیاتی ذوق کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ مگر میں کیا کرتا۔ ہر شخص کو اپنی پسند کی چیز کھانے اور پہننے کی آزادی ہے۔

تلون انسان کی فطرت ہے ——— وہ کبھی ایک چیز پر قائم نہیں رہتا، اسی لئے اس کے گرد و پیش کا ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر آج اُسے مرغیاں مرغوب ہیں۔ تو مارکیٹ میں لاکھوں مرغیاں ایک دم آجائیں گی ——— لیکن جب اسکا دل ان سے اکتا جائے گا، تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرغیاں یا تو انڈے دینا بند کر دیں گی یا اُسے سنیں گی نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اگر لوگ پانی پینا بند کر دیں، تو سارے کنوئیں خشک ہو جائیں۔ دریا اپنے کو بیکار سمجھ کر اپنا رُخ بدل لیں۔

میں آج سے پندرہ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں ——— آرگنڈی (اسے رفل کہا جاتا تھا) کی بنی بنائی قمیصوں کا رواج عورتوں میں عام تھا ——— لیکن دو تین برسوں کے بعد یہ قمیصیں ایسی غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ——— اتنے برس گذر چکے ہیں، مگر اب یہ کپڑا جو جانوروں کی کھال کے مانند اکڑا ہوتا تھا۔ کسی عورت کے بدن میں نظر نہیں آیا ——— ظاہر ہے

کہ اس کا بنانا یا تو یکسر بند کر دیا گیا ہے ——— یا بہت کم مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔

میں اب اصل موضوع کی طرف آتا ہوں، زیادہ عرصہ نہیں گذرا، ہم جنسیت کا بازار پنجاب میں ہر جگہ گرم تھا۔ مردوں کی اکثریت اس غیر فطری فعل میں شغل فرماتی تھی۔ اور ایسے لڑکے بہ افراط موجود تھے، جن کی ادائیں دیکھ کر نوخیز لڑکیاں بھی شرمائیں ——— ان کی چال ڈھال کچھ ایسی قیامت خیز ہوتی تھی، کہ لعبتش پسند مرد، اپنی عورتوں کو بھول جاتے تھے،

میں اُسی زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، جب لڑکیوں کے بدلے اُن کی مخالف جنس کا دَور دورہ تھا ——— میں اپنے مکان کی بیٹھک میں اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا، کہ باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کوئی بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے

امرتسر میں ہنگامے برپا ہونا۔ اُن دنوں معمولی بات تھی ———

میں نے سوچا کہ ہندو مسلم کا فساد ہو گیا ہے۔ لیکن اپنے اس اندیشے کا ذکر ہندو دوست سے نہ کیا جو میرا ہم جماعت تھا۔

ہم دونوں گلی سے باہر نکلے ——— دیکھا کہ بازار میں سب دکانیں بند ہیں ——— بڑی حیرت ہوئی کہ ماجرا کیا ہے؟ ——— ہم گلی کے باہر کھڑے تھے، کہ اتنے میں شہر کا ایک بہت بڑا غنڈہ آیا۔ اس کے ساتھ

میں ہا کی تھی، جو خون سے لتھڑی ہوئی تھی ۔ اُس نے مجھے سلام کیا، اس لئے
کہ وہ مجھے پہچانتا تھا کہ میں ایک ذی اثر آدمی کا بیٹا ہوں۔ سلام کرنے کے
بعد اُس نے میرے دوست کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوا "میاں
صاحب ——— بابو جی سے کہیئے کہ یہاں کھڑے نہ رہیں ——— آپ انہیں
اپنے مکان میں لے جائیں"

بعد میں معلوم ہوا کہ جو خون خرابہ ہوا۔ اس کا باعث میرا دوست تھا۔
اُس کے کئی طالب تھے ——— دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ جن میں اُس کی وجہ سے
لڑائی ہوئی، جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے ——— شہر کا جو سب سے بڑا
غنڈہ تھا، چوتھے پانچویں روز اِسے دوسری پارٹی نے اس قدر زخمی کر دیا۔
کہ دس دن اُسے ہسپتال میں رہنا پڑا جو اس کی غنڈہ گردی کا سب سے بڑا
ریکارڈ تھا۔

اہلِ لاہور اچھی طرح جانتے ہوں گے، کہ یہاں ایک لڑکا "ڈینی سنگھ" کے
نام سے تھا، جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس کے ایک پرستار نے اُسے
ایک بہت بڑی موٹر کار دے رکھی تھی ۔ وہ اس میں بڑے ٹھاٹھ
سے آتا، اور دوسرے لڑکے جو اُسی زمرے میں آتے تھے ——— بہت
جلتے ——— مگر لاہور میں اُس وقت "ڈینی سنگھ" ہی کا طوطی بولتا تھا، میں نے
اُس کو دیکھا، واقعی خوبصورت تھا۔

اب یہ حال ہے کہ کوئی ہیٹی سنگھ نظر نہیں آتا، کالجوں میں چلے جایئے۔
وہاں آپ کو ایسا کوئی لڑکا نظر نہیں آئے گا، جس میں نسوانیت کے خلاف
کوئی چیلنج ہو۔ اس لئے کہ اب ان کی جگہ لڑکیوں نے لے لی ہے۔ قدرت
نے اُن کی اِفنا کر دی ہے،
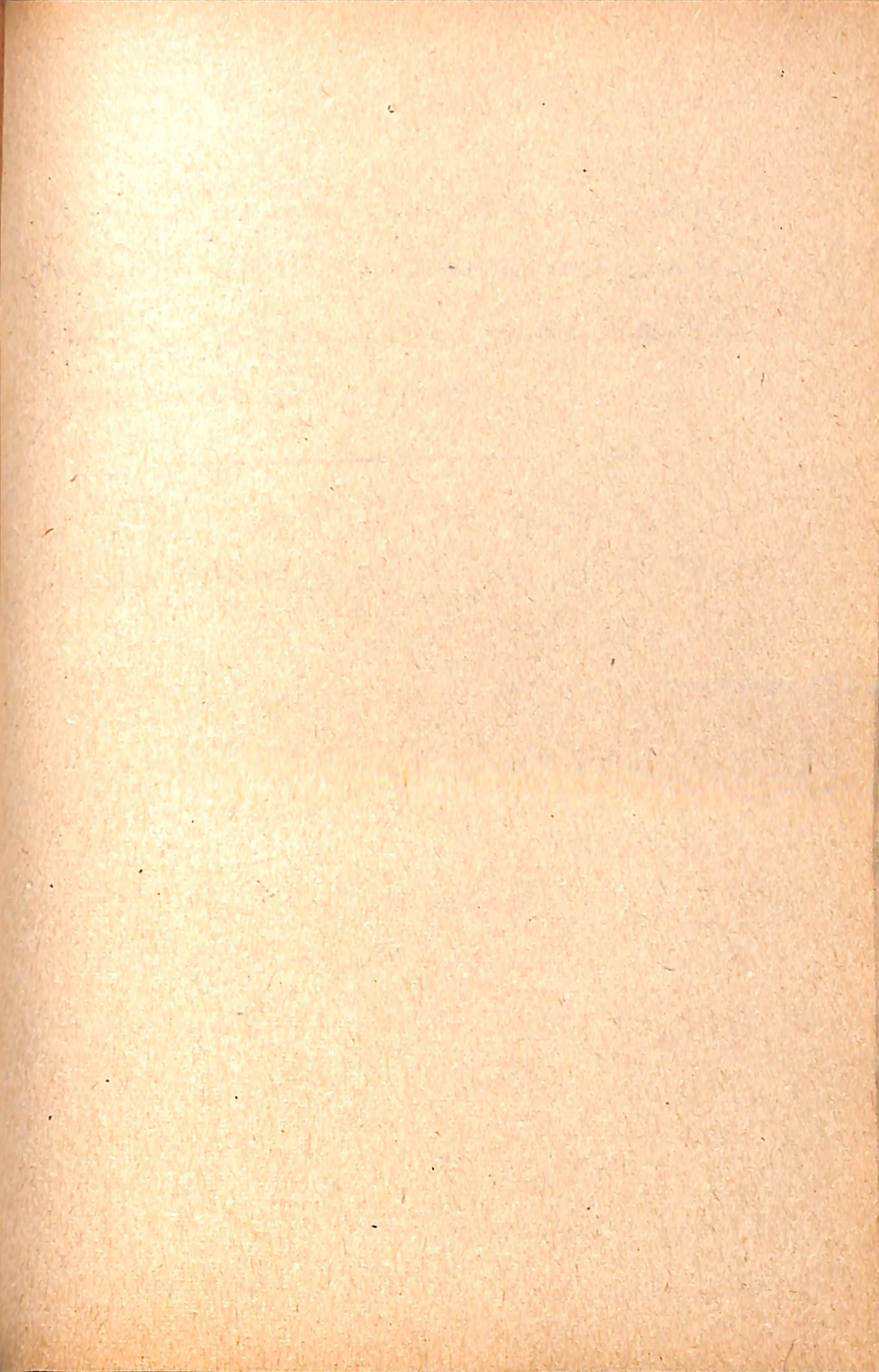
خوشبودار تیل
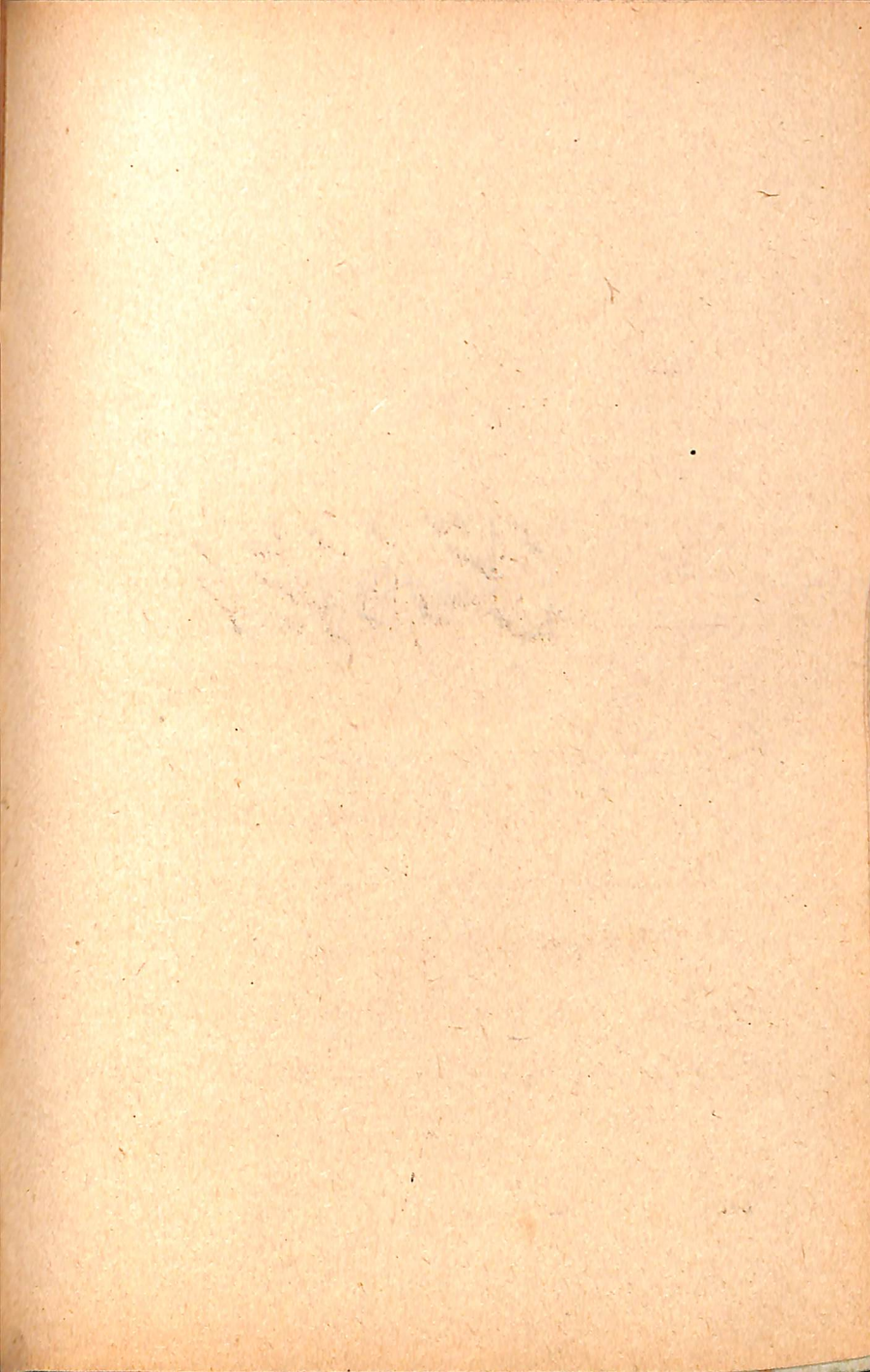
"آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو ——— اچھا بھلا ہوں ——— مجھے کیا تکلیف تھی؟"

"تکلیف تو آپ کو کبھی نہیں ہوئی ——— ایک فقط میں ہوں جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف یا عارضہ چمٹا رہتا ہے۔"

"یہ تمہاری بد احتیاطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے ——— ورنہ آدمی کو کم از کم سال بھر میں دس مہینے تو تندرست رہنا چاہیئے۔"

"آپ تو بارہ مہینے تندرست رہتے ہیں ——— ابھی پچھلے دنوں دو مہینے ہسپتال میں رہے ——— میرا خیال ہے اب پھر آپ کا وہیں جانے کا ارادہ ہے۔"

"ہسپتال میں جانے کا ارادہ کون کرتا ہے؟"

"آپ ایسے آدمی، اور کس کا دماغ پھرا ہے کہ وہ بیمار ہو کر وہاں جائے۔ اور اپنے عزیزوں کی جان کا عذاب بن جائے"

"تو گویا، میں اپنے سب رشتہ داروں کی جان کا عذاب بنا بیٹھا ہوں ——— میرا تو یہ نظریہ ہے کہ ہر رشتے دار خود جان کا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے"

"آپ کو تو رشتہ داروں کی کوئی پرواہ نہیں ——— حالانکہ وے ہمیشہ آپ کے آڑے وقت میں کام آتے رہے ہیں"

"کونسے آڑے وقت میں کام آئے"

"پچھلے برس جب آپ بیمار ہوئے ——— تو کس نے آپ کے علاج پر روپیہ خرچ کیا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں ——— میرا خیال ہے تمہیں نے کیا ہوگا"

"آپ کا حافظہ بھی اب کمزور ہو گیا ہے ——— یا آپ جان بوجھ کر اپنے رشتے دار کی مدد کو فراموش کر رہے ہیں"

"میں اپنے کسی رشتے دار کی امداد کا محتاج نہیں رہا اور نہ رہونگا ——— اچھا خاصہ کما لیتا ہوں ——— کھاتا ہوں پیتا ہوں ———"

"جتنا کھا سکتا ہوں، کھاتا ہوں ـــــــ جتنی پی سکتا ہوں۔ پیتا ہوں۔"

"آپ کو معلوم نہیں کہ پینا حرام ہے؟"

"معلوم ہے ـــــــ آج کل تو جینا بھی حرام ہے ـــــــ مگر چچا غالب کہہ گئے ہیں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

"یہ چچا غالب کون تھے ـــــــ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟ ـــــــ میں نے تو آج پہلی مرتبہ ان کا نام سنا ہے۔"

"وہ سب کے چچا تھے ـــــــ بہت بڑے شاعر ـــــــ"

"شاعروں پر خدا کی لعنت ـــــــ بیڑا غرق کرتے ہیں لوگوں کا۔"

"بیگم یہ تم کیا کہہ رہی ہو، انہی کے دم سے تو زندگی کی رونق قائم ہے۔ یہ نہ ہوں تو چاروں طرف خشکی ہی خشکی نظر آئے ـــــــ یہ لوگ پھول ہوتے ہیں، صاف و شفاف پانی کے دھارے ہوتے ہیں ـــــــ جو انسانوں کے ذہن کی آبیاری کرتے ہیں ـــــــ یہ نہ ہوں تو ہماری زندگی بے نمک ہو جائے۔"

"بے نمک ہو جائے ـــــــ کیسے بے نمک ہو جائے ـــــــ

یہاں نمک کی کوئی کمی ہے ــــــ جتنا چاہیئے، لے لیجئے ــــــ اور وہ بھی سستے داموں پر ــــــ ان لوگوں کو جنہیں آپ شاعر کہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ان کو کھیوڑے کی کسی کان میں زندہ دفن کر دیا جائے، تاکہ وہ بھی نمک بن جائیں، اور آپ اُن کو چاٹتے رہیں۔"

"آج تم نے یہ کیسے پر پُرزے نکال لئے؟"

"پر پُرزوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی ــــــ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جب آپ سے کوئی معاملے کی بات کرے تو آپ بھنّا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ ــــــ میں نے کبھی آپ کی ذات پر تو حملہ نہیں کیا، ہمیشہ سیدھی سادی بات کرتی ہوں۔"

"تمہاری سیدھی باتیں ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہیں ــــــ میری سمجھ میں نہیں آتا، تمہیں ہو کیا گیا ہے ــــــ دو برس سے تم ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو ــــــ؟"

"ان برسوں میں مجھے آپ نے کیا سُکھ پہنچایا ہے ــــــ؟"

"بھئی معاف کرو مجھے ــــــ میں سونا چاہتا ہوں ــــــ ساری رات جاگتا رہا ہوں۔"

"کیا تکلیف تھی آپ کو ــــــ مجھے بھی تو کچھ اس کا علم ہو۔"

"تمہیں اگر اس کا علم بھی ہو جائے، تو اس کا اوا کیا

کرو گی ـــــــ؟"

"میں تو سخت نااہل ہوں، کسی کام کی بھی نہیں ــــــــ بس ایک صرف آپ ہیں، جو دنیا کی ساری حکمت جانتے ہیں۔"

"بھئی، میں نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا ــــــــ لیکن عورت ذات ہمیشہ خود کو افضل سمجھتی ہے ــــــــ حالانکہ وہ عام طور پر کم عقل ہوتی ہے۔"

"دیکھیے، آپ طعن طروز پر اُتر آئے ــــــــ یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں ــــــــ تم نے چونکہ مجھے اکسایا تو یہ لفظ میری زبان سے نکل گئے، ورنہ تم جانتی ہو کہ میں گفتگو کے معاملے میں بڑا محتاط رہتا ہوں۔"

"جی ہاں ــــــــ رہتے ہوں گے ــــــــ مجھ سے تو آپ نے ہمیشہ نوکرانیوں کا سا سلوک کیا۔"

"یہ سراسر بہتان ہے ــــــــ تم تو میری ملکہ ہو۔"

"آپ بادشاہ کیسے بن بیٹھے ــــــــ آپ کی سلطنت کہاں ہے؟"

"میری سلطنت یہ میرا گھر ہے ــــــــ میں ــــــــ"

"اور آپ یہاں کے شہنشاہ ہیں۔"

یہاں نمک کی کوئی کمی ہے ـــــ جتنا چاہیئے، لے لیجئے ـــــ اور وہ بھی سستے داموں پر ـــــ ان لوگوں کو جنہیں آپ شاعر کہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ان کو کھیوڑے کی کسی کان میں زندہ دفن کر دیا جائے، تاکہ وہ بھی نمک بن جائیں، اور آپ اُن کو چاٹتے رہیں۔"

"آج تم نے یہ کیسے پر پُرزے نکال لئے؟"

"پر پُرزوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی ـــــ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جب آپ سے کوئی معاملے کی بات کرے تو آپ بھنّا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ ـــــ میں نے کبھی آپ کی ذات پر تو حملہ نہیں کیا، ہمیشہ سیدھی سادی بات کرتی ہوں۔"

"تمہاری سیدھی باتیں ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہیں ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا، تمہیں ہو کیا گیا ہے ـــــ دو برس سے تم ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو ـــــ؟"

"ان برسوں میں مجھے آپ نے کیا سُکھ پہنچایا ہے ـــــ؟"

"بھئی معاف کر دو مجھے ـــــ میں سونا چاہتا ہوں ـــــ ساری رات جاگتا رہا ہوں۔"

"کیا تکلیف تھی آپ کو ـــــ مجھے بھی تو کچھ اس کا علم ہو۔"

"تمہیں اگر اس کا علم بھی ہو جائے، تو اس کا اوا کیا

کردگی ——؟"

"میں تو سخت نااہل ہوں، کسی کام کی بھی نہیں —— بس ایک صرف آپ ہیں، جو دنیا کی ساری حکمت جانتے ہیں۔"

"بھئی، میں نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا —— لیکن عورت ذات ہمیشہ خود کو افضل سمجھتی ہے —— حالانکہ وہ عام طور پر کم عقل ہوتی ہے۔"

"دیکھیے، آپ طعن طرو ز پر اُتر آئے —— یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں —— تم نے چونکہ مجھے اکسایا تو یہ لفظ میری زبان سے نکل گئے، ورنہ تم جانتی ہو کہ میں گفتگو کے معاملے میں بڑا محتاط رہتا ہوں۔"

"جی ہاں —— رہتے ہوں گے —— مجھ سے تو آپ نے ہمیشہ نوکرانیوں کا سا سلوک کیا۔"

"یہ سراسر بہتان ہے —— تم تو میری ملکہ ہو۔"

"آپ بادشاہ کیسے بن بیٹھے —— آپ کی سلطنت کہاں ہے؟"

"میری سلطنت یہ میرا گھر ہے —— میں ——"

"اور آپ یہاں کے شہنشاہ ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے —— تم نے طنزاً کہا ہے، لیکن حقیقت میں اس سلطنت کا حکمراں میں ہی ہوں۔"

"حکمران تو میں ہوں —— اس لئے کہ اس گھر کا سارا بندوبست مجھے ہی کرنا پڑتا ہے —— سب دیکھ بھال مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔"

"تم میری ملکہ ہو —— اور ملکہ کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہنا چاہیئے —— اپنی مملکت کا دھیان رکھنا چاہیئے —— اسلئے تم بھی یہاں کی حکمران ہو، اس لئے کہ تم اس کا نظم ونسق برقرار رکھتی ہو —— نوکروں سے اچھا کام لیتی ہو —— اچھے سے اچھا کھانا پکواتی ہو —— گو سارا دن پلنگ پر لیٹی آرام کرتی رہتی ہو۔"

"میں تو جو آرام کرتی ہوں، سو کرتی ہوں، پر آپ مجھے یہ بتائیے ——"

"کیا"

"کچھ نہیں —— آپ اس گھر کے حکمران ہیں، اب میں آپ سے کیا کہوں۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، بلا خوف وخطر کہو —— تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے۔"

"کہیں جہاں پناہ بگڑ نہ جائیں۔"

"مذاق ہر طرف رکھو، یہ بتاؤ، تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"کہنا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں، مگر آپ میں ٹھنڈے دل سے سننے کا مادہ ہی کہاں ہے"؟

"مادہ تو تم ہو ـــــــ میں نر ہوں"

"اب آپ نے واہیات قسم کی گفتگو شروع کردی ـــــــ"

"کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایسی باتیں بھی کرلینی چاہئیں ـــــــ اس لئے کہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو"

"آپ کی طبیعت میں کئی دنوں سے انقباض ہے ـــــــ سیدھے منہ کوئی بات ہی نہیں کرتے"

"میں تو چنگا بھلا ہوں ـــــــ مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ہے ـــــــ ہوسکتا ہے کہ تمہارے تخیل نے بہت اونچی پرواز کی ہو، اور وہاں سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہو کہ میری طبیعت کو قبض ہوگیا ہے ـــــــ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی مسہل تجویز کردو، تاکہ تمہاری تشفی ہوجائے"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی ـــــــ صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں ـــــــ"

"بھئی پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے ـــــــ مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو"

"آپ تو ذرا سی بات پر تنگ آجاتے ہیں"

"یہ ذرا سی بات ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی بکواس کرائی ـــــــ

"اس میں کیا شک ہے ـــــــ تم نے طنزاً کہا ہے، لیکن حقیقت میں اس سلطنت کا حکمراں میں ہی ہوں۔"

"حکمران تو میں ہوں ـــــــ اس لئے کہ اس گھر کا سارا بندوبست مجھے ہی کرنا پڑتا ہے ـــــــ سب دیکھ بھال مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔"

"تم میری ملکہ ہو ـــــــ اور ملکہ کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہنا چاہیئے ـــــــ اپنی مملکت کا دھیان رکھنا چاہیئے ـــــــ اسلئے تم بھی یہاں کی حکمران ہو، اس لئے کہ تم اس کا نظم ونسق برقرار رکھتی ہو ـــــــ نوکروں سے اچھا کام لیتی ہو ـــــــ اچھے سے اچھا کھانا پکواتی ہو ـــــــ گو سارا دن پلنگ پر لیٹی آرام کرتی رہتی ہو۔"

"میں تو جو آرام کرتی ہوں، سو کرتی ہوں، پر آپ مجھے یہ بتائے ـــــــ"

"کیا"

"کچھ نہیں ـــــــ آپ اس گھر کے حکمران ہیں، اب میں آپ سے کیا کہوں۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، بلا خوف وخطر کہو ـــــــ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے۔"

"کہیں جہاں پناہ بگڑ نہ جائیں۔"

"مذاق برطرف رکھو، یہ بتاؤ، تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"کہنا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں، مگر آپ میں ٹھنڈے دل سے سننے کا مادہ ہی کہاں ہے"؟

"مادہ تو تم ہو، ——— میں نر ہوں"

"اب آپ نے واہیات قسم کی گفتگو شروع کر دی ———"

"کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایسی باتیں بھی کرنی چاہئیں ——— اس لئے کہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو"

"آپ کی طبیعت میں کئی دنوں سے انقباض ہے ——— سیدھے منہ کوئی بات ہی نہیں کرتے"

"میں تو چنگا بھلا ہوں ——— مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں، ہے ——— ہو سکتا ہے کہ تمہارے تخیل نے بہت اونچی پرواز کی ہو، اور وہاں سے یہ نتیجہ بر آمد کیا ہو کہ میری طبیعت کو قبض ہو گیا ہے ——— اگر ایسا ہی ہے تو کوئی مسہل تجویز کر دو، تاکہ تمہاری تشفی ہو جائے"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی ——— صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں ———"

"بھئی پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے ——— مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو"

"آپ تو ذرا سی بات پر تنگ آجاتے ہیں"

"یہ ذرا سی بات ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی بکواس کرائی ———

یہی وقت میں اور کہیں صرف کرتا، تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔"

"کیا فائدہ ہوتا ——— بڑے لاکھوں کما لیئے ہیں آپ نے بغیر اس بکواس کے۔"

"کمائے تو ہیں ——— لیکن تم یہ بتاؤ۔ کہ کہنا کیا چاہتی ہو"؟

"میں یہ کہنا چاہتی تھی، کہ جب سے نئی نوکرانی آئی ہے، آپ کی طبیعت کیوں خراب رہنے لگی ہے؟ ———"

"نئی نوکرانی کو کوئی بیماری ہے"؟

"جی نہیں ——— بیماری تو نہیں ——— لیکن میں نے اُسے آج رخصت کر دیا ہے۔"

"کیوں؟ وہ تو بڑی اچھی تھی۔"

"آپ کی نظروں میں ہوگی ——— میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ بیس روپلے ماہوار میں اتنے اچھے کپڑے کیسے پہن سکتی تھی ——— بالوں میں خوشبودار تیل کہاں سے ڈالتی تھی۔"

"مجھے کیا معلوم"؟

"آپ کو سب کچھ معلوم ہے ——— آپ کے بالوں سے بھی

اُسی تیل کی خوشبو آتی ہے ۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں یہ تیل آپ نے کہاں چھپا کے رکھا ہے۔"
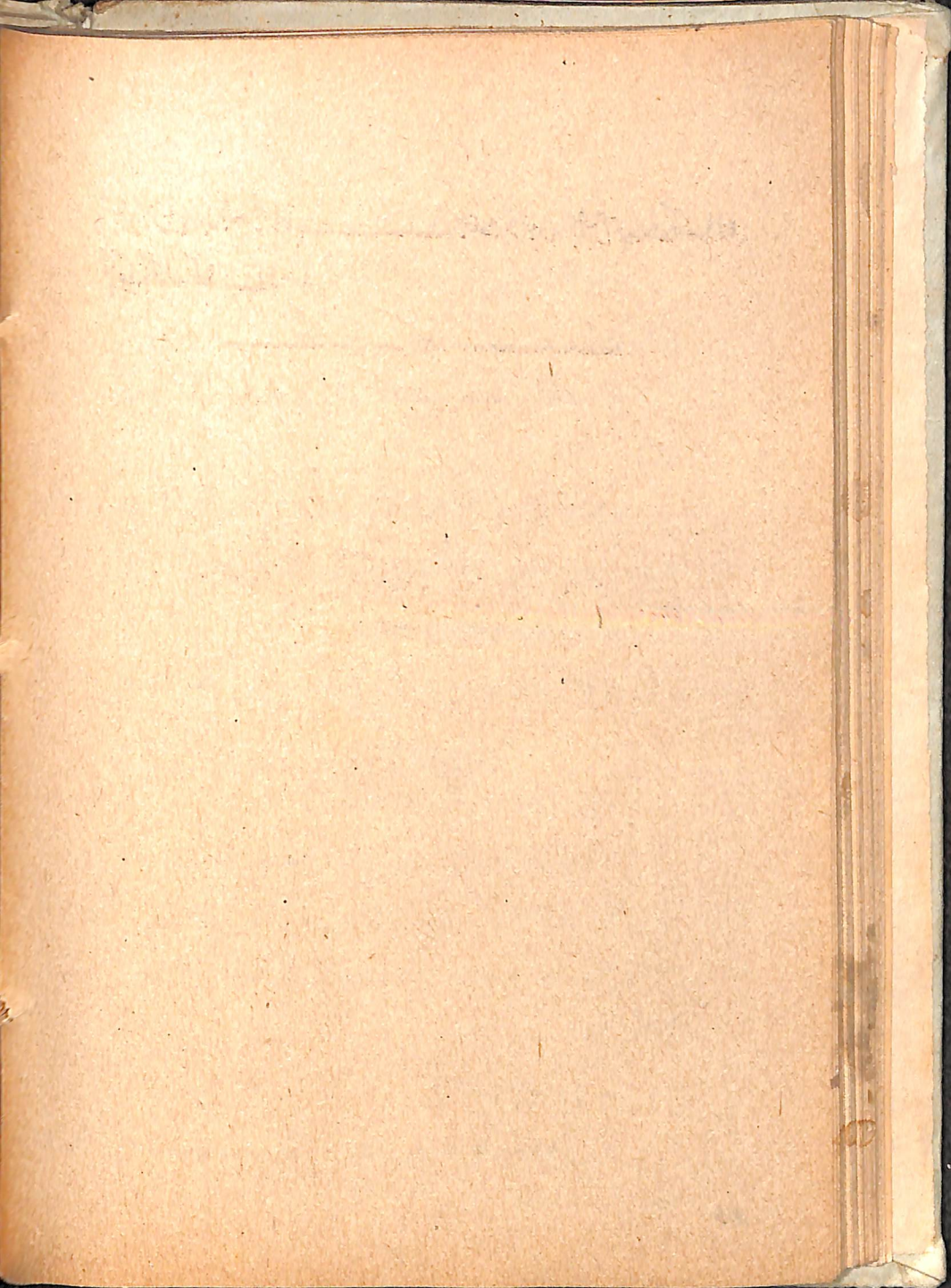
سنتر پنچ
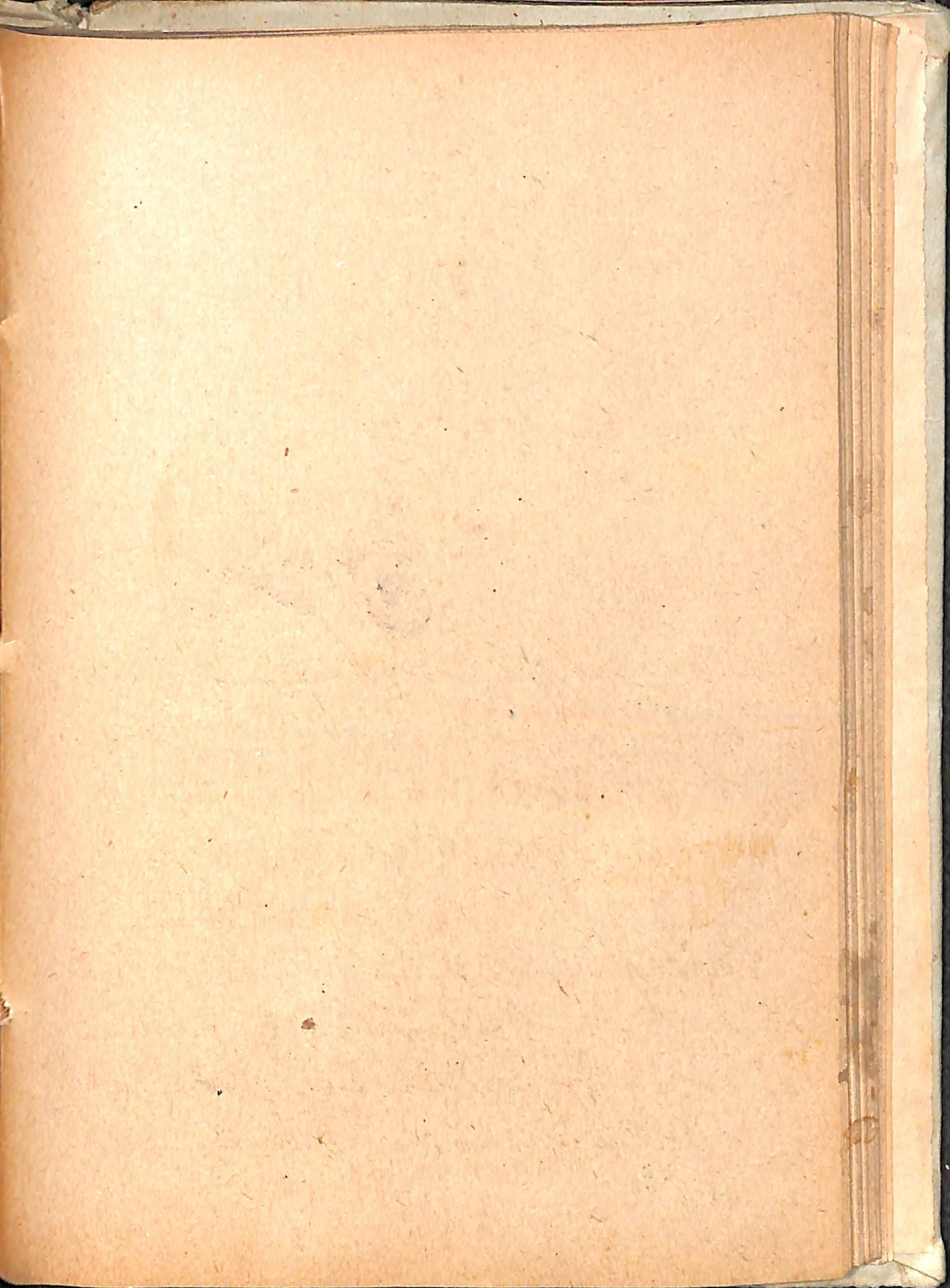
میں لاہور کے ایک اسٹوڈیو میں ملازم ہوا۔ جس کا مالک میرا بمبئی کا
دوست تھا۔ اس لئے میرا استقبال کیا، میں اسی کی گاڑی میں اسٹوڈیو پہنچا تھا۔
بغل گیر ہونے کے بعد اُس نے اپنی شرارت بھری مونچھوں کو جو غالباً کئی
دنوں سے ناتراشیدہ تھیں، تھرکا کر کہا "کیوں خواجہ، چھوڑ دی"
میں نے جواب دیا "چھوڑنی پڑی"
اسٹوڈیو کا مالک جو اچھا فلم ڈائرکٹر بھی ہے (میں اسے سہولت کی خاطر
گیلانی کہوں گا) مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا —— یہاں اِدھر
اُدھر کی بے شمار باتیں کرنے کے بعد اس نے چائے منگوائی۔ جو نہایت
ذلیل تھی، زبردستی پلائی، کئی سگریٹ اس دوران میں خود پھونکے اور مجھ سے

پھنکوائے

مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، چنانچہ میں نے اُس سے کہا: "یار چھوڑو اب چائے کی بکواس کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آج اتنے برسوں کے بعد یاد کیسے کر لیا؟"

"بس ایک دن اچانک یاد آ گئے ——— بلا لیا ——— بتاؤ اب صحت کیسی ہے؟"

"تمہاری دُعا سے ٹھیک ہے۔" میرے لہجے میں دوستانہ طنز تھا۔

وہ ہنسا: "واہ میرے مولوی صاحب ——— میرا خیال ہے کہ جب سے تم خشک خشک ہوئے ہو۔ تمہاری ہر وقت شگفتہ رہنے والی طبیعت ٹھہرے پانی کی طرح ٹھہر گئی ہے۔"

"ہو گا ایسا ہی۔"

"ہو گا کیا، ہے ہی ایسا معاملہ ———۔ لیکن خدا نہ کرے ایسی ذہانت جس کے سب معترف ہیں، اُس کا بھی یہی حشر ہوا ——— کیا تم اب بھی فلمی کہانی کا ڈھانچہ تیار کر سکتے ہو ——— فرسٹ کلاس کہانی کا؟"

میں نے اُس سے کہا: "فرسٹ، سیکنڈ، انٹر اور تھرڈ، میں نہیں جانتا، البتہ کہانی ضرور ہو گی ——— تم سوچتے ہو فرسٹ کی کہانی وہ اسکرین پر آتے ہی تھرڈ بن جائے ——— یا تھرڈ جس کو تم نے ڈبوں میں بند

کرکے گودام میں رکھ چھوڑا تھا، گولڈن جبلی فلم ثابت ہُوا ——— کیا درست نہیں؟ ——— خیر ان باتوں کو چھوڑو ——— تم یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟"

اُس نے مجھے ایک سگریٹ سُلگا کر دیا اور سنجیدگی سے کہا "دیکھو منٹو، بس ایک ایسی کہانی چاہتا ہوں، ——— بڑا دلچسپ رومان ہو، اور تم مجھے اُس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتے کے اندر اندر دیدو، کیونکہ میں فلم ڈسٹری بیوٹر سے کنٹریکٹ کر چکا ہوں، تم سینریو کتنی دیر میں لکھ لوگے؟"

"فراغت سے ایک مہینے کے بعد"

سردیوں کا موسم تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے زور کے ساتھ ملے ——— اس کے اس عمل سے دو چیزیں ظاہر ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ اس کے ہاتھ گرم ہو گئے ہیں، دوم یہ کہ اُس کے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے کہ اس کو کہانی وقت پر مل جائے گی اور وہ جو کہ میری طرح بڑی تیزی سے کام کرنے والا ہے اُسے وقتِ مقررہ کے اندر اندر ڈائرکٹ کر کے اس کے پرنٹ، ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کر دے گا، اور کنٹریکٹ کی رُو سے جو بقایا رقم اُس کے نام نکلتی تھی، اُسی وقت میز پہ دھروائے گا۔

اُس نے چند لمحات غور کیا "کل ہی کام شروع کر دے گا"

میں نے جواب دیا: "کام تو میں شروع کر دوں ——— لیکن یہاں میرے لئے کوئی علیحدہ کمرہ ہونا چاہیئے۔"

"ہو جائے گا۔"

"اور ایک اسسٹنٹ۔"

"مل جائے گا ——— تو کل سے آنا شروع کر دو گے؟"

میں نے اُس سے کہا: "دیکھو گیلانی ——— میرے گھر سے اور تمہارے اسٹوڈیو تک کا فاصلہ کافی ہے ——— تانگے میں آؤں تو قریب قریب ڈیڑھ گھنٹہ ——— بس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اُس نے پوچھا: "کیوں؟"

"یعنی اُس کا انتظار کرنا پڑتا ہے ——— بس اسٹینڈ پر کھڑے رہے ہو ——— خدا خدا کر کے پانچ نمبر کی بس آگئی۔ مسافروں سے بھری ہوئی اور وہ بغیر ٹھہرے چل دی، اور تم خود کو دنیا کا کم ترین انسان محسوس کرتے ہو ——— جی میں آتا ہے کہ خودکشی کر لو ——— یا پھر دنیا والوں کی بے رُخی سے نجات حاصل کرنے کے لئے سنیاس دھار لو۔"

گیلانی نے اپنی شرارت بھری مونچھیں تھرکائیں "میں شرط بدنے کیلئے تیار ہوں کہ تم کبھی دنیا تیاگ نہیں سکتے، جس دنیا میں کہ ہر قسم کی شراب

ملتی ہے ــــــــ اور خوبصورت عورتیں بھی!"

میں نے چڑکر کہا " عورتیں جائیں جہنم میں ــــــــ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں بمبئی کے ہر اسٹوڈیو میں جہاں میں نے کام کیا، ان سے دور ہی رہا۔

"تم تو خیر اپنے وقت کے ڈون جو دران ہو" (DON JYAN)

"مذاق اڑاتے ہو تو خواجہ میرا"

میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا۔ نہیں گیلانی ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ــــــــ

یا یوں کہہ لو ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

گیلانی مسکرایا " خدائے بخشندہ تو بڑے عرصے سے تمہیں مرحوم و مغفور کر چکا ہے ــــــــ تم بخشی ہوئی روح ہو"

میں نے کہا " اس سے کیا ہوتا ہے ــــــــ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں"

فلسفہ مت بگھارو یار ــــــــ یہ بتاؤ کیا ابھی تک تمہارے پاس وہ اردو ٹائپ رائٹر موجود ہے"؟

"اچھا تم یہ بتاؤ کہ وہ ایکٹرس جس سے تم نے کلکتے میں شادی کی تھی

ابھی تک تمہارے پاس موجود ہے؟"

گیلانی نے فخریہ انداز میں جواب دیا "موجود کیوں نہیں ہوگی —— گویا تمہاری نظر میں ایکٹرس اور ٹائپ رائٹر میں کوئی فرق نہیں ؟"

میں نے اس سے کہا "کیا فرق ہے؟ —— ایک فلم پر ٹائپ کرتی ہے دوسری کاغذ پر —— دونوں کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہیں ۔"

گیلانی میری ان باتوں سے تنگ آگیا تھا ۔ آخر میں نے اس کو دلاسا دیا "یار یہ سب مذاق تھا —— تو میں کل آجاؤں —— میرا مطلب ہے تم گاڑی بھیج دو گے ؟"

گیلانی صوفے پر سے اٹھا ، اس کے ساتھ میں بھی ۔ اس نے کہا "ہاں ہاں بھئی —— کب چاہیئے تمہیں گاڑی ؟"

"کوئی وقت بھی مقرر کر لو —— ساڑھے نو بجے صبح ۔"

"ٹھیک ہے ۔"

"تم کاغذ وغیرہ آج ہی منگوا لینا —— تاکہ میں اسٹوڈیو پہنچتے ہی کام شروع کر دوں اور تم سے یہ الٹا نہ سنوں کہ دیکھو تم نے مجھے لیٹ ڈاؤن کر دیا —— میرا اتنے ہزار روپے کا نقصان ہو گیا ہے ۔"

گیلانی نے بڑے پیار سے کہا "کیا کہتے ہو یار ——— میں تمہاری طبیعت سے کیا واقف نہیں ——— کبھی کبھی تم ڈبکی لگا جایا کرتے ہو۔

میں نے اس کو یقین دلایا "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ تم مطمئن رہو۔ ہاں ہاں میرا ٹائپ رائٹر یہاں محفوظ تو رہے گا؟"

گیلانی کی عادت ہے کہ وہ ذرا ذراسی بات پر چڑ جاتا ہے "محفوظ نہیں رہے گا تو کیا غنڈے اغوا کر لے جائیں گے ——— اپنے کسی عاشق کے ساتھ تمہاری مشین بھاگ نکلے گی؟"

میں بہت ہنسا ——— ہنستے ہنساتے ہم دونوں نے اسٹوڈیو کا چکر لگایا ——— اس کے بعد اُس نے مجھے الوداع کہی اور میں اُسی گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگیا، جہاں پہنچتے ہی میں نے اپنے ٹائپ رائٹنگ کی جھاڑ پونچھ کی، اس لئے کہ ایک مدت سے میں نے اُسے استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ فلمی کہانی لکھنے کا اس دوران میں کوئی موقعہ ہی میسّر نہ آیا۔"

بگڑا ہوا ہیکنک یا مستری آرٹسٹ بن جاتا ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی اختراع کردہ محاورہ ہے۔ گیلانی شروع شروع میں ہیکنک تھا بگڑ کر وہ آرٹسٹ بن گیا، پر وہ محنتی تھا۔ جب وہ مستری تھا تو اسے زیادہ سہولتیں میسّر نہیں تھیں۔ لیکن جب کیمرہ قلی سے ترقی کرتا کرتا کیمرہ مین بن گیا تو اُس نے

کیمرے کے ہر پیچ کے متعلق اپنی خداداد ذہانت اور جستجو طلب طبیعت کی بدولت یہ دریافت کر لیا کہ اُن کا لوہے کے اس چوکھٹے میں اپنی اپنی جگہ کیا مصرف ہے۔

کیمرے کو وہ الٹا کرتا۔ کبھی سیدھا، کبھی اُس کا گیٹ کھول کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اُس سے اپنے مختلف سائز کے پیچ پرزوں کے ذریعے سے بوس و کنار میں مشغول رہتا۔

فرصت کے اوقات یعنی جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی، وہ اپنی سائیکل پر شہر پہنچتا اور سارا دن کباڑیوں کی دکانوں پر صرف کرتا ——— اُس کو دنیا کے تمام کباڑیوں سے محبت ہے، اور ان کے کباڑ خانوں کو وہ بڑی مقدس جگہیں تصور کرتا ہے۔ وہ ان دکانوں میں بیٹھ کر منصوبے بنایا کرتا رہتا، کہ سلائی کی مشین کا ہینڈل جو بیکار پڑا ہے۔ اگر لوہے کے فلاں ٹکڑے کے ساتھ ویلڈ کر دیا جائے اور اس کے فلاں کے اندر چھوٹے پنکھے جو نکڑ والی دکان میں موجود ہیں لگا دیئے جائیں تو فرسٹ کلاس دھونکنی بن سکتی ہے۔

خدا معلوم وہ کیا کیا سوچتا تھا۔ ان دنوں دراصل ذہنی ورزش کر رہا تھا یہ وہ تیاری تھی جو وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ایڈیٹنگ بھی اس طرح سیکھی، آس پاس کی ہر تھتی سے تھتی

نے کا مطالعہ کیا، اور آخر ایک دن اُس نے اسٹوڈیو کی ایک فلم کی ایسی عمدہ ڈبنگ
کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سیٹھ نے سوچا کہ اچھے کیمرہ مین تو مل جائیں گے، مگر
ایسا باکمال ایڈیٹر جو سیلولائٹ کے چھوٹے بڑے فیتے کے ٹکڑوں کو اس
چابکدستی سے جوڑتا ہے کہ پھر اس میں مزید کتر بیونت ہو ہی نہیں سکتی۔
چنانچہ ایڈیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دیا۔ تنخواہ اس کی وہی رہی جو حیثیت
کیمرہ مین تھی۔

وہ اپنا کام بڑی محنت اور تن دہی سے کرتا رہا، لیکن اس کے ساتھ
ساتھ ہی وہ لیبارٹری سے بھی دلچسپی لیتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس نے
اُس کے کل پرزوں میں چند اصلاحات اور ترکیبیں پیش کیں جو بڑی ردوکد
کے بعد قبول کر لی گئیں۔ نتیجہ دیکھا گیا، تو بڑا حوصلہ افزا تھا۔

سیٹھ نے ایک دن سوچا، کیوں نہ گیلانی کو ایک فلم ڈائرکٹ کرنے کا
موقعہ دیا جائے۔ جب اُس سے پوچھا کہ تم کوئی فلم ڈائرکٹ کر لو گے۔ تو
اُس نے بڑی خود اطمینانی سے جواب دیا "ہاں سیٹھ —— پر اس
میں کوئی دخل نہ دے"

کہانی آدھی گیلانی نے خود بنائی، آدھی اِدھر اُدھر کے منشیوں سے
لکھوائی اور اللہ کا نام لے کر شوٹنگ شروع کر دی۔ یہ فلم ختم ہوا اور نمائش
کے لئے مقامی سینما ہاؤس میں پیش کیا گیا تو اس نے اگلے پچھلے تمام

ریکارڈ توڑ دیئے۔

اس کے بعد اس نے لاہور میں دو فلم بنائے ——— یہ بھی سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئے ——— ایک کلکتے جا کر پھر بنایا، وہ بھی کامیاب تھا یہاں وہ بمبئی پہنچا، کیونکہ وہاں کے فلمسازوں نے بڑی تگڑی تگڑی آفریں بھیجی تھیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس نے آفر قبول کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور کہانی چن اس کا منظر نامہ خود تیار کیا۔ فلم بن گیا اور اتنا بڑا باکس آفس ثابت نہ ہوا، شاید اس لئے کہ بٹوارے کے باعث دوسرے شہروں کے مانند بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے جس طرح دوسرے مسلمان ہجرت کر رہے تھے۔ اس طرح گیانی بھی بمبئی چھوڑ کر کراچی چلا گیا یہاں سے وہ لاہور پہنچا اور ایک اسٹوڈیو کی داغ بیل رکھی، ساؤنڈ پروف سیٹ سے لے کر کیلیں ٹھوکنے والے تک کو اس کی ذاتی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا قصہ مختصر یہ کہ اسٹوڈیو تیار ہو گیا۔

لاہور کے مسلمان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے ——— جب یہ اسٹوڈیو بنا تو ان کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ یہاں شوٹنگ شروع ہو گئی اس کے بعد یہ چل نکلا۔ گیانی اس دوران میں، اسٹیج اور ادھر ادھر کے متعلقہ سامان کو درست اور مرمت کرانے میں مشغول رہا۔ اس کا دستِ راست لاہور ہی کا ایک نوجوان سراج دین تھا، جو قریب قریب آٹھ برس ٹائپ رائٹروں کی

مرمت کرنے کا کام کر رہا تھا، اُسے اپنے اس کام میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس کو بھی گیلانی کے مانند الٹنے پلٹنے کا شوق اور خبط تھا۔

ریلوے انجن کس طرح چلتا ہے۔ ریزر بلیڈ کیا ہاتھ سے نہیں بنائے جا سکتے۔ حساب کتاب کرنے والی مشین کن اصولوں کے ماتحت جمع تفریق کرتی ہے۔ یہ گیسیں کیا ہوتی ہیں۔

میرا اُس کا تعارف ہو چکا تھا۔ حسب معمول میں ایک دن کمرے کے باہر دھوپ میں کرسیاں اور میز رکھے، کہانی کا طویل مختصر خلاصہ ٹائپ کر رہا تھا کہ وہ آیا۔ سلام و دعا کے بعد اُس نے جھک کر بڑے غور سے میرے ٹائپ رائٹر کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور کہا "منٹو صاحب ٹائپ کرنا بند کیجئے۔ یہ دو روز کے اندر آپ کو جواب دے جائیگا۔"

میں اس سے وجہ پوچھنے ہی والا تھا کہ گیلانی نے بڑے سخت لہجے میں پوچھا "کیوں، کیا بات ہے سراج"

سراج نے مؤدبانہ جواب دیا "حضور! یہ دو تین روز کے اندر اندر خراب ہو جائے گا ——— اس کے رولر کا ربڑ سوکھ کر پتھر بن گیا ہے ——— یہ جو چھوٹے چھوٹے سے رولر کاغذ اوپر کھینچتے ہیں بالکل فالودہ ہو گئے ہیں۔

گیلانی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "تو کیا، جاؤ ان میں دودھ ملائی

ڈال کر کھا لوٹ

اس کے بعد گیلانی نے خود میرے ٹائپ رائٹر کا معائنہ کیا اور فیصلہ صادر کیا کہ مشین میں کوئی نقص نہیں ــــــــ مگر سراج اپنے تجربے کے بل بوتے پر مصر تھا "نہیں حضور یہ اب مرمت طلب ہو چکی ہے۔ بڑے اور چھوٹے رولر سب نئے لگوانے پڑیں گے۔ ادھر ہا لنگ ہوگی، اس کا کتا بھی ناقص ہو چکا ہے۔ وہ بھی پڑے گا"

"تمہاری ٹانگوں پر"

"آپ میرا مذاق نہ اڑائیے ــــــــ اچھا، خیر آپ ہی صحیح کہتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ اپنے گنجے سر پر ٹوپی درست کرتا ہوا چلا گیا۔ گیلانی نے اپنا خاص ٹول بکس منگوایا، اور مشین کے سب پرزے الگ کر کے رکھ دیئے۔ کوئی پرزہ پتھر پر گھسایا، کوئی ریگ مارپہ، کسی کے سریش لگائی، کسی کے تیل اور اور ان کو دوبارہ فٹ کر کے فتحمندانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں صاحب، ٹھیک ہو گئی یا نہیں"

میں نے ایسے ہی کہہ دیا "ہاں، اب ٹھیک ہے"

گیلانی نے اپنے پاس کھڑے اسسٹنٹ کو بلایا "جاؤ، اس اُلو کے پٹھے ایکسپرٹ سراج کو بلا کر لاؤ"

چند منٹوں میں سراج حاضر ہو گیا۔ اس نے مشین چلائی تو دس پندرہ

ٹپ ٹپ کرنے کے بعد ہی خاموش ہو گئی۔ سراج نے گیلانی سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیلانی بڑے تحکمانہ لہجے میں اُس سے مخاطب ہُوا "اچھا تم اسے بناؤ، دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو۔"

مجھے اپنی پندرہ سالہ عزیز مشین کی اس درگت پر ترس آ رہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جب اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہولے میری آنکھوں کے سامنے پڑے تھے۔ دوسرے دن سراج نے اپنا ٹول بکس ریکارڈ روم میں سے منگوایا اور میری مشین پر اپنی ماہرانہ سرجری شروع کر دی۔

ضروری پرزے نکال کر اس نے علیحدہ رکھ لئے اور باقی حصے پٹرول کے ٹب میں ڈال دیئے۔ اب ان کی چتا جلانے کے لئے صرف ماچس کی ایک تیلی کافی تھی

میں خاموش بیٹھا، یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

کتے کے جبڑوں کو ایک پلاس کے ساتھ زور سے پکڑا، اور میری طرف دیکھ کر کہا "اس سالے کے دندانے ٹھیک کر کے ہی رہوں گا پہلے تو ایسے ہی کوشش کرتا ہوں، اگر نہ ہوئے تو اس پرزے ہی کو باہر نکال کر ورکشاپ جا کر اس کا نقص رفع کر دوں گا ——— بڑا سخت اسٹیلی ہوتا ہے، اس کو مشین کی تمام لیسنر کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔"

میں ہوں ہوں کرتا رہا اور وہ مجھے لیکچراتا رہا ——— اُس نے چھوٹی

پلاسما سے چھوٹے پیچ کس سے بہت جتن کی کہ وہ کتا باہر نکل آئے، لیکن وہ کچھ عجیب ڈھیٹ تھا۔ یہ کتے کے پالنے والے ہی جانتے ہوں گے کہ وہ کس نسل کا تھا

سراج لگا رہا۔ اس کوشش میں اس نے آدھا گھنٹہ اور صرف کیا اور وہ دم دبا کر باہر نکل آیا اور سراج نے اُسے یوں الٹا یا جیسے وہ ننھا سا پلا ہے۔

اب اس پلے پر کام شروع ہوگیا۔ ورکشاپ کے سارے اوزار آزمائے مگر اس کے جبڑے ٹھیک نہ ہوئے ـــــــ آخر اس کے استاد نے سراج سے کہا: "اسے سنتر پنچ کرو۔ دوبارہ سنتر پنچ کرنے پر بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ دوسرے روز شہر کا بہت بڑا گنی مستری سراج کے ساتھ تھا۔ اُس نے دُور سے مجھے سلام کیا اور مسکرا کر کہا: "ملٹو صاحب اب کوئی فکر نہ کیجئے"۔

اصل میں مجھے کوئی فکر نہیں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد مجھے جستجو ہوئی کہ دیکھیں اپنے وقت کے یہ نیوٹن کیا کاریگری دکھاتے ہیں۔ ورکشاپ پہنچا تو سنتر پنچ اُن کے جھریوں بھرے ہاتھ ہیں ـــــــ میں کباب ہوگیا اور وہاں سے اُٹھ بھاگا، تاکہ وہ میرا بھی سنتر پنچ کردیں اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ناکارہ ہوجاؤں۔

ڈانس فلمایا جارہا تھا، میں اس کے شاٹس دیکھ کر اپنا غم غلط کرتا

"ہاں ــــ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ غم رتی بھر غلط نہیں ہُوا تھا۔ کیوں کہ ڈائرکٹر کی شکل اُس سے بہت ملتی جُلتی تھی۔

رات جب پیک اپ ہوا تو بارہ بج رہے تھے، مجھے اتفاق سے ایک تانگہ مل گیا ــــ جب سڑک پر اُس نے اپنا سفر شروع کیا تو دو فرلانگ کے فاصلے پر میں نے ایک سایہ دیکھا۔ جب قریب پہنچے تو وہ سراج تھا۔ ایک دم میں زور سے چلایا "پکڑ لو اس آدمی کو اور اس کا تن سر تنخ کر دو۔"

یہ سنتے ہی وہ اس تیزی سے بھاگا "تانگہ اُس کا مقابلہ نہ کر سکا، ہم اُسے جا لیتے مگر وہ ایک کیبنٹ میں کُود پڑا۔ میں ہنسا۔ اُس نے شاید یہ سمجھا ہوگا کہ اُس کا تن سر سے جُدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

... ...

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے سراج سے پوچھا "بڑی دیر لگا دی"

سراج نے ٹوپی اُتار کر ایک طرف چارپائی پر رکھی اور کہا "شکر ہے خدا کا ــــ جان بچی سو لاکھوں پائے ــــ ایک ڈاکو سڑک پر میرا سر تن تنخ کرنے والا تھا۔"

اُس کی بیوی نے پوچھا "یہ سر تن کیا ہوتا ہے"!

"اس وقت نہیں ــــ رات کو ــــ اوزار میرے پاس ہیں"

... ...
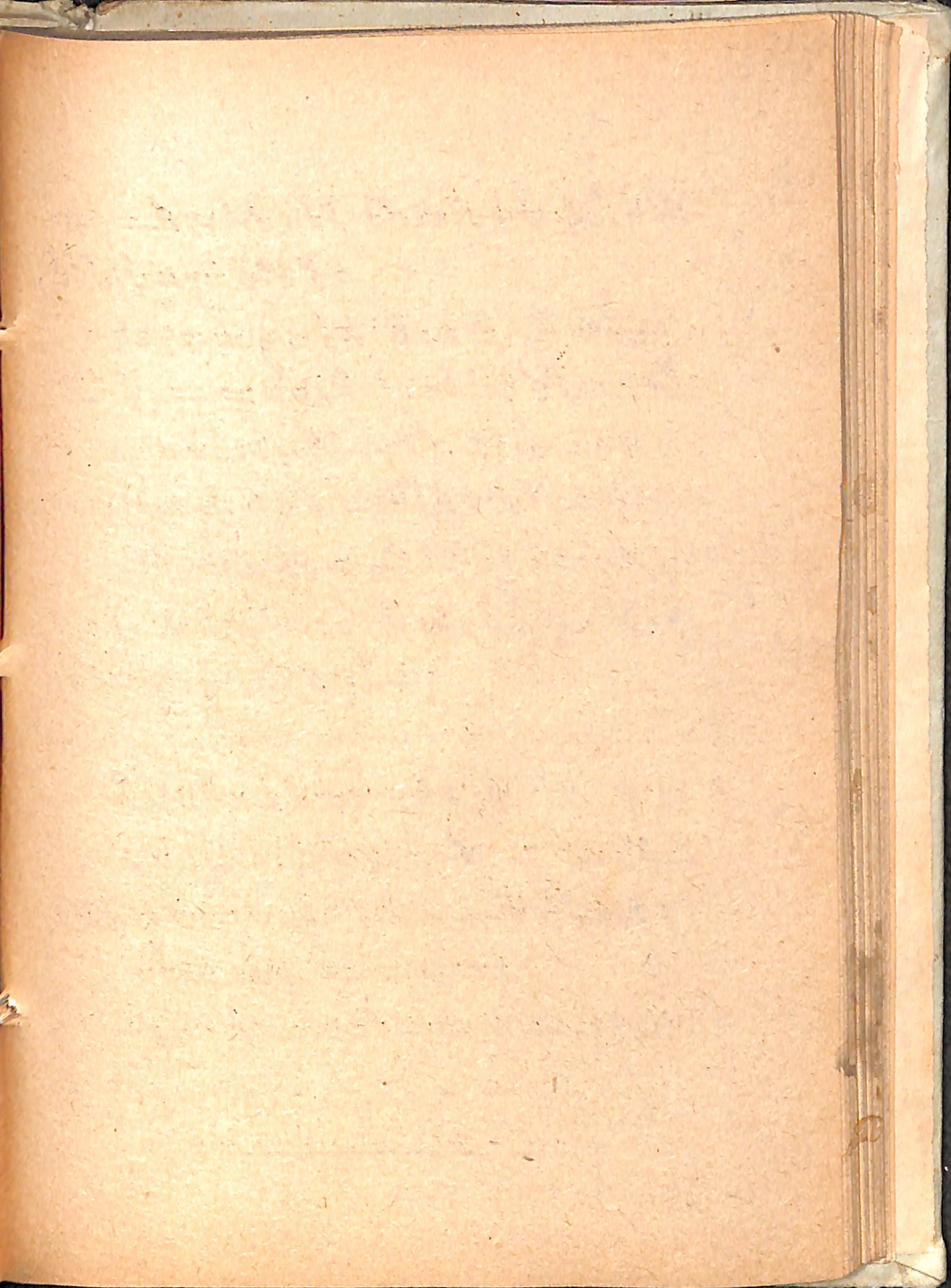
جسم اور رُوح
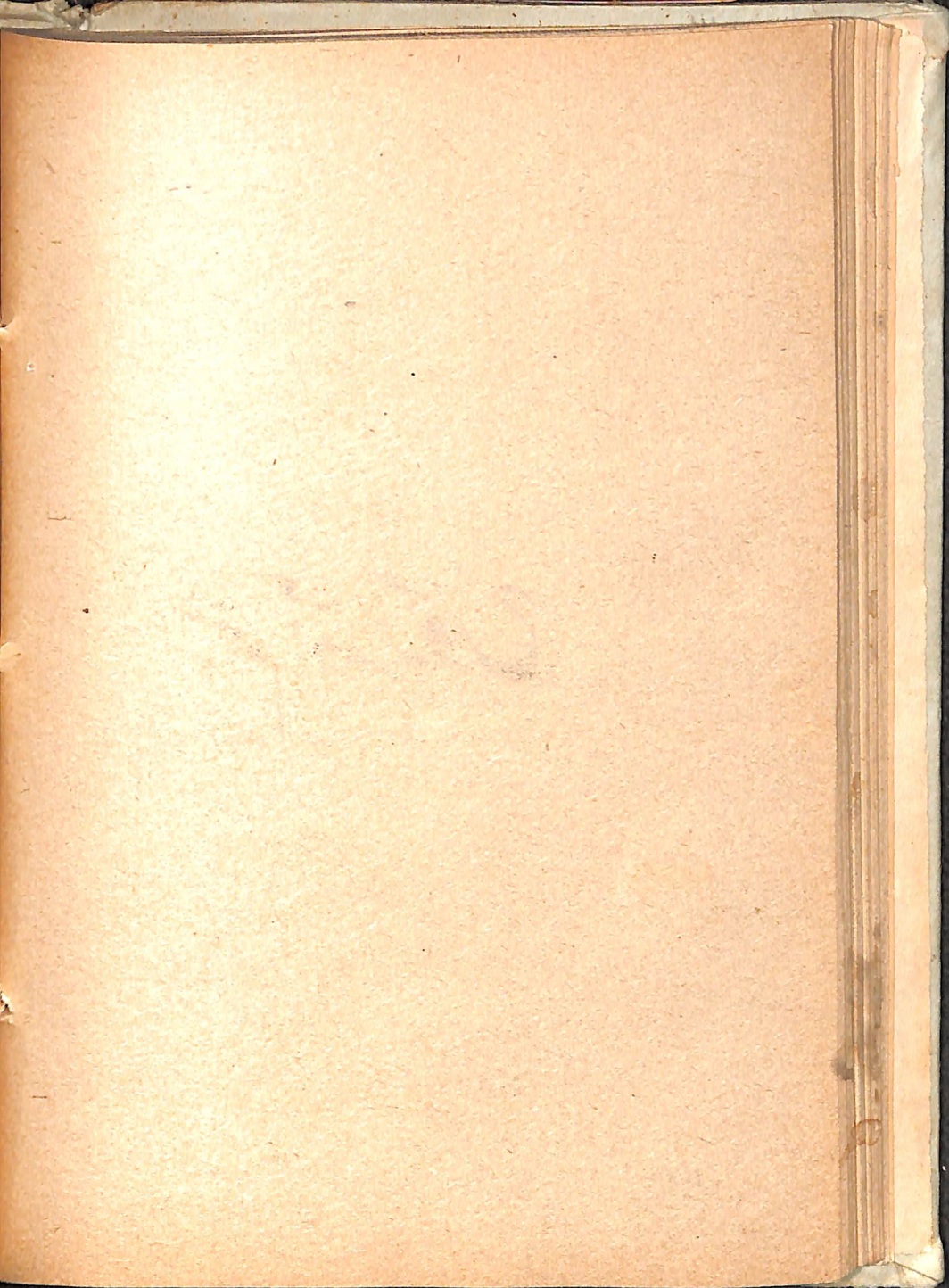
مجیب نے اچانک مجھ سے سوال کیا "کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟"

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دنیا میں ایسے کئی اشخاص موجود ہیں جو ایک منٹ کے اندر اندر لاکھوں اور کروڑوں کو ضرب دے سکتے ہیں۔ ان کی تقسیم کر سکتے ہیں ——— آنے پائی کا حساب چشم زدن میں آپ کو بتا سکتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں شمسی یہ کہہ رہا تھا "انگلستان میں ایک آدمی ہے جو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد فوراً بتا دیتا ہے کہ اس قطعہ زمین کا طول و عرض کیا ہے ——— رقبہ کتنا ہے ——— اُس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ وہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے تنگ آگیا ہے وہ جب

بھی کہیں باہر کھلے کھیتوں میں نکلتا ہے تو ان کی ہریالی، ان کا حسن اس کی نگاہ ہوتا ہے اور جلی ہو جاتا ہے اور وہ اس قطعۂ زمین کی پیمائش اپنی آنکھوں کے ذریعے سے شروع کر دیتا ہے ایک منٹ کے اندر اندر وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا کتنا رقبہ رکھتا ہے ــــــ اس کی لمبائی کتنی ہے، چوڑائی کتنی ہے، پھر اُسے مجبوراً اپنے اندازے کا امتحان لینا پڑتا ہے "فیتہ ٹیپ" کے ذریعے سے اس قطعۂ زمین کو ناپتا اور وہ اُس کے اندازے کے عین مطابق نکلتا ــــــ اگر اس کا اندازہ غلط ہوتا۔ تو اسے بہت تسکین ہوتی، بعض اوقات فاتح اپنی شکست سے بھی ایسی لذت محسوس کرتا ہے، جو اُسے فتح سے نہیں ملتی، اصل میں شکست، دوسری شاندار فتح کا خیمہ ہوتی ہے۔"

میں نے مغنی سے کہا "تم درست کہتے ہو ــــــ دنیا میں ہر قسم کے عجائبات موجود ہیں ــــــ"

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مجیب جو اس گفتگو کے دوران خاموش کا گھونٹ پی رہا تھا، اچانک مجھ سے سوال کیا "کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟"

میں سوچنے لگا کہ مجیب کس آدمی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

حامد ــــــ نہیں، وہ آدمی نہیں، میرا دوست ہے۔

عباس ــــــ اس کے متعلق کچھ کہنے سُننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں

ہو سکتی تھی ——— شبّیر، اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی ———
آخر یہ کس آدمی کا حوالہ دیا گیا تھا؟۔
میں نے مجیب سے کہا۔ "تم کس آدمی کا حوالہ دے رہے ہو؟"
مجیب مسکرایا۔ "تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔"
"بھئی، میرا حافظہ تو بچپن ہی سے کمزور رہا ہے ——— تم پہیلیوں میں باتیں نہ کرو ——— بتاؤ وہ کون آدمی ہے، جس سے تم ہمارا تعارف کرانا چاہتے ہو۔"
مجیب کی مسکراہٹ میں اب ایک عجیب قسم کا اسرار تھا۔ "بوجھ لو۔"
"میں کیا بوجھوں گا جبکہ وہ آدمی تمہارے پیٹ میں ہے۔"
عارف، اصغر اور مسعود بے اختیار ہنس پڑے۔ عارف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "وہ آدمی اگر مجیب کے پیٹ میں ہے تو آپ کو اس کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔"
میں نے مجیب کی طرف ایک نظر دیکھا اور عارف سے مخاطب ہوا۔ "میں اپنی ساری عمر اس مہدی کی ولادت کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔"
مسعود نے اپنے سگریٹ کو ایش ٹرے کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے، صاحبان! ہمیں اپنے دوست مسٹر مجیب کی بات کا مذاق نہیں اڑانا چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ مجیب سے مخاطب ہوا۔ "مجیب

صاحب، فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے ——— ہم سب بڑے غور سے سنیں گے۔

مجیب تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اپنا بجھا ہوا چرٹ سلگا کر بولا "معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اُس آدمی کے متعلق آپ سے پوچھا جسے آپ جانتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "مجیب تم کیسی باتیں کرتے ہو، بہرحال تم اس آدمی کو جانتے ہو۔"

مجیب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا "بہت اچھی طرح ——— جب ہم دونوں برما میں تھے تو دن رات اکھٹے رہتے تھے ——— عجیب و غریب آدمی تھا۔"

مسعود نے پوچھا "کس لحاظ سے؟"

مجیب نے جواب دیا "ہر لحاظ سے ——— اُس جیسا آدمی، آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

میں نے کہا "بھائی مجیب، اب بتا بھی دو، وہ کون حضرت تھے۔"

"وہ بس حضرت ہی تھے۔"

عارف مسکرایا "چلو قصہ ختم ہوا ——— وہ حضرت تھے اور بس۔"

مسعود یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ وہ حضرت کون تھے: "بھئی مجیب تمہاری ہر بات نرالی ہوتی ہے ـــــــ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ وہ کون آدمی تھا، یا ہے، جس کا ذکر تم نے اچانک چھیڑ دیا"

مجیب طبعاً خاموشی پسند تھا، اس کے دوست احباب ہمیشہ اس کی طبیعت سے نالاں رہتے ـــــــ لیکن اس کی باتیں جچی تلی ہوتی تھیں۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا: "معذرت خواہ ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کو اس مخمصے میں گرفتار کر دیا ـــــــ بات دراصل یہ ہے کہ جب یہ گفتگو شروع ہوئی تو میں کھو گیا ـــــــ مجھے مجھے وہ زمانہ آگیا، جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

میں نے پوچھا "وہ ایسا زمانہ کونسا تھا؟"

مجیب نے اب ایک لمبی کہانی بیان کرنا شروع کر دی: "اگر آپ سمجھتے ہوں کہ اس زمانے سے میری زندگی کے کسی رومان کا تعلق ہے، تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کم فہم ہیں"

میں نے مجیب سے کہا: "ہم تو آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں ـــــــ اگر آپ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم کم فہم ہیں تو ٹھیک ہے لیکن وہ آدمی ـــــــ؟

مجیب مسکرایا: "وہ آدمی، آدمی تھا ـــــــ لیکن اس میں خدا نے

بہت سی قوتیں بخشی تھیں۔"

مسعود نے پوچھا "مثال کے طور پر۔" ————

"مثال کے طور پر یہ کہ وہ ایک نظر دیکھنے کے بعد بتا سکتا تھا کہ آپ نے کس رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ ٹائی کیسی تھی۔ آپ کی ناک ٹیڑھی تھی۔ یا سیدھی ———— آپ کے کس گال پر کہاں اور کس جگہ تل تھا ———— آپ کے ناخن کیسے ہیں۔ آپ کی داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔ آپ نے بھنوئیں مونڈھی ہوئی ہیں ———— موزے فلاں ساخت کے پہنے ہوئے تھے ———— قمیض پوپلین کی تھی، مگر گھر میں دھلی ہوئی۔"

یہ سن کر میں نے دفعتاً محسوس کیا کہ جس شخص کا ذکر حبیب کر رہا ہے ———— عجیب و غریب ہستی کا مالک ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا "بڑا مصر کہ خیز آدمی تھا۔"

"جی ہاں ———— بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ———— اس کو اس بات کا غم تھا کہ اگر وہ کوئی منظر، کوئی مرد، کوئی عورت، صرف ایک نظر دیکھ لے تو وہ اسے من و عن اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے، جو کبھی غلط نہیں ہوں گے ———— اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اندازہ ہمیشہ درست ہوتا تھا ————"

میں نے پوچھا "کیا یہ واقعی درست ہے؟"

"سو فیصد ——— ایک مرتبہ میں نے اس سے بازار میں پوچھا، یہ لڑکی جو ابھی ہمارے پاس سے گذری ہے، کیا تم اس کے متعلق تمام تفصیلات بیان کر سکتے ہو"

میں اس لڑکی سے ایک گھنٹہ پہلے مل چکا تھا۔ وہ ہمارے ہمسائے مسٹر نوجوائے کی بیٹی تھی اور میری بیوی سے سلائی کی مشین استعار لینے آئی تھی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا تھا، اسی لئے، بغرضِ امتحان میں نے مجیب سے یہ سوال کیا تھا۔

مجیب مسکرایا "تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ——— میں ——— میں ———"

"نہیں تم میرا امتحان لینا چاہتے تھے ——— خیر سنو ——— وہ لڑکی جو ابھی ہمارے پاس سے گذری ہے، اور جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا ——— مگر لباس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے، اس لئے کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں سلامت ہوں اور ہوش و حواس درست ہوں، کہہ سکتا ہے، کہ وہ کس قسم کا تھا ——— ویسے ایک چیز جو مجھے اس میں خاص طور پر دکھائی دی، وہ اس کے داہنے ہاتھ کی چھینگلیاں تھی۔ اس میں کسی قدر خم ہے ——— اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن معیوب تھا ———

اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرائش کے فن سے محض کوری ہے ــــــ"

مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے کہ اُس نے ایک معمولی سی نظر میں یہ سب چیزیں کیسے بھانپ لیں ــــــ میں ابھی اس حیرت میں غرق تھا کہ مجیب نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اس میں جو خاص چیز مجھے نظر آئی، وہ اُس کے داہنے گال کا داغ تھا ــــــ غالباً لاہور سول پھوڑے کا ہے"

مجیب کا کہنا درست تھا، میں نے اُس سے پوچھا "یہ سب باتیں جو تم اتنے وثوق سے کہتے ہو۔ تمہیں کیونکر معلوم ہو جاتی ہیں؟"

مجیب مسکرایا "میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا ــــــ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں ہر آدمی کو صاحب نظر ہونا چاہیئے ــــــ صاحب نظر سے میری مراد ہر اُس شخص سے ہے جو ایک ہی نظر میں دوسرے آدمی کے تمام خدوخال دیکھ لے"

میں نے اُس سے پوچھا "خدوخال دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے ــــــ خدوخال ہی تو انسان کا صحیح کردار بیان کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے ــــــ میں تمہارے اس نظریے سے متفق نہیں ہوں۔"

"نہ ہو ــــــ مگر میرا نظریہ اپنی جگہ قائم رہے گا"

"رہے، مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے ـــــ بہر حال میں یہ
کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان غلطی کا پتلا ہے ـــــ ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو۔"
"یار غلطیاں درستیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔"
"یہ تمہارا عجیب فلسفہ ہے۔"
"فلسفہ گائے کا گوبر ہے۔"
"اور گوبر؟"
مجیب مسکرایا۔ "وہ ـــــ وہ؟ ـــــ اُپلا کہہ لیجئے۔ جو ایندھن کے
کام آتا ہے۔"
ہمیں معلوم ہُوا کہ مجیب ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے پہلی ہی نگاہ
میں اس نے اس کے جسم کے ہر خدوخال کا صحیح جائزہ لے لیا تھا۔
وہ لڑکی بہت متاثر ہوئی۔ جب اُسے معلوم ہُوا کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی
موجود ہیں، جو صرف ایک نظر میں سب چیزیں دیکھ جاتے ہیں، تو وہ مجیب سے
شادی کرنے کے لئے رضامند ہو گئی۔
اُن کی شادی ہو گئی ـــــ دلہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے۔ اُس کی وائیں
کلائی میں کس ڈیزائن کی دستی چھپی تھی ـــــ اُس میں کتنے نگینے تھے ـــــ
یہ سب تفصیلات اُس نے ہمیں بتائیں۔
....
ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہو گئی ـــــ

محض اس لئے کہ مجیب صرف ان چیزوں کو صرف ایک نظر میں دیکھکر اپنے ذہن میں
کسی تکلیف کے بغیر محفوظ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ روح کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں
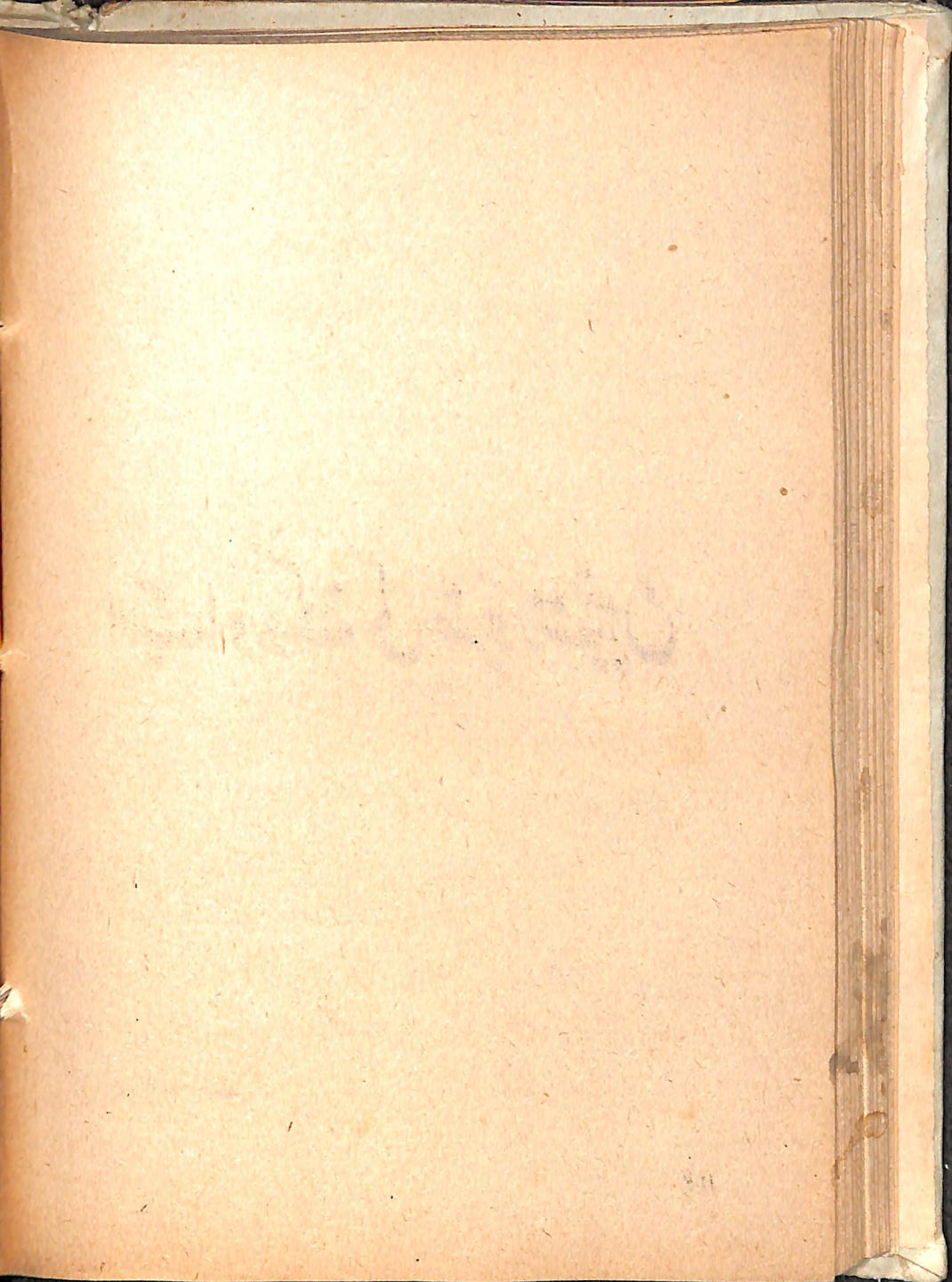
یہ دُنیا بھی عجیب و غریب ہے —— خاص کر آج کا زمانہ ——
قانون کو جس طرح فریب دیا جاتا ہے، اس کے متعلق شاید آپ کو زیادہ علم نہ ہو۔ آج کل قانون ایک بے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اِدھر کوئی نیا قانون بنتا ہے، اُدھر یہ لوگ اُس کا توڑ سوچ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے بچاؤ کی کئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔

کسی اخبار پر آفت آنی ہو تو آیا کرے، اس کا مالک محفوظ و مامون رہے گا، اس لئے کہ پرنٹ لائن میں کسی قصائی یا دھوبی کا نام بحیثیت پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کے درج ہوگا —— اگر اخبار میں کوئی ایسی تحریر چھپ گئی، جس پر گورنمنٹ کو اعتراض ہو، تو اصل مالک کے بجائے، وہ

دھوبی یا قصائی گرفت میں آجائے گا۔ اس کو جرمانہ ہوگا، یا قید ——— جرمانہ تو ظاہر ہے کہ اخبار کا مالک ادا کردے گا، مگر قید تو وہ ادا نہیں کرسکتا، لیکن ان دو پارٹیوں کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر قید ہوئی تو وہ اس کے گھر اتنے روپے ماہوار پہنچا دیا کرے گا۔

ایسے معاہدوں میں خلاف ورزی بہت کم ہوتی ہے۔

جو لوگ ناجائز طور پر شراب بیچتے ہیں، اُن کے پاس دو تین آدمی ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں، جن کا صرف یہ کام ہے کہ اگر پولیس چھاپہ مارے تو وہ گرفتار ہوجائیں اور چند ماہ کی قید کاٹ کر واپس آجائیں۔ اُس کا معاوضہ اِن کو معقول مل جاتا ہے۔

چھاپہ مارنے والے بھی پہلے ہی۔ یہ مطلع کردیتے ہیں کہ ہم آرہے ہیں، تم اپنا انتظام کرلو ——— چنانچہ فوراً انتظام کرلیا جاتا ہے، یعنی مالک غائب غلہ ہوجاتا ہے اور وہ کرائے کے آدمی گرفتار ہوجاتے ہیں، ——— یہ بھی ایک قسم کی ملازمت ہے، لیکن دنیا میں جتنی ملازمتیں ہیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا "امین، اس دفعہ کیسے جیل میں گئے؟"

ابین مسکرایا "اپنے کاروبار کے سلسلے میں"

"کیا کاروبار تھا؟"

"جو رہا ہے، وہی تھا"

"بھئی بتاؤ تو؟"

"بتانے کی کیا ضرورت ہے ——— آپ اچھی طرح جانتے ہیں مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں"

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اُس سے کہا "ابین، تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے؟"

ابین پہلوان مسکرایا "جناب ——— پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں، حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل تک نہیں دیکھی ——— اَن پڑھ ہوں ——— کوئی اور ہنر بھی مجھے نہیں آتا ——— بس جیل جانا آتا ہے ——— وہاں میں خوش رہتا ہوں ——— مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی ——— آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں ——— کیا وہ جیل نہیں؟"

میں لاجواب ہو گیا "تم ٹھیک کہتے ہو ابین ——— لیکن دفتر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے ——— لوگ اُنہیں بُری نگاہوں

سے نہیں دیکھتے۔"

"کیوں نہیں دیکھتے ——— ضلع کچہری کے جتنے منشی اور کلرک ہیں، اُنہیں کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے ——— رشوتیں لیتے ہیں ——— جھوٹ بولتے ہیں، اور پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں ——— مجھ میں ایسا کوئی عیب نہیں ——— میں اپنی روزی بڑی ایمانداری سے کماتا ہوں۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "کس طرح۔"

اُس نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کاٹتا ہوں، جیل میں محنت و مشقت کرتا ہوں، اور بعد میں اُس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا بھگتی تھی، مجھے دو تین سو روپے ملتا ہے، تو یہ میرا معاوضہ ہے ——— اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ——— میں رشوت تو نہیں لیتا حلال کی کمائی کھاتا ہوں ——— لوگ مجھے غنڈہ سمجھتے ہیں ——— بڑا خطرناک غنڈہ ——— لیکن میں آپ کو بتاؤں، کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا ——— میری لائن بالکل الگ ہے۔"

اُس کی لائن واقعی دوسروں سے الگ تھی، مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کاٹنے کے باوجود۔ اُس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، وہ بڑا سنجیدہ، مگر گنوار قسم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پرواہ نہیں تھی قید کاٹنے کے بعد جب بھی

آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاؤنڈ زیادہ ہوتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا "این، کیا وہاں کا کھانا تمہیں راس آتا ہے؟"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "کھانا کیسا بھی ہو، اس کو راس کرنا آدمی کا اپنا کام ہے ——— مجھے دال سے نفرت تھی، لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں کنکروں بھری دال دی گئی اور ریت ملی روٹی تو میں نے کہا ——— این یار ——— یہ سب سے اچھا کھانا ہے کھا، ڈنڈ پیل اور خدا کا شکر بجا لا ——— چنانچہ میں ایک دو روز ہی میں اس کا عادی ہو گیا مشقت کرتا، کھانا کھاتا اور یوں محسوس کرتا، جیسے میں نے گنجے کے ہوٹل سے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے ———"

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا "این! تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے؟"

اُس نے اپنے دونوں کان پکڑے "خدا بچائے، اس محبت سے، مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے"

میں نے اُس سے پوچھا "تمہاری ماں زندہ ہے؟"

"جی ہاں ——— خدا کے فضل و کرم سے ——— بہت بوڑھی

ہے۔ لیکن آپ کی دُعا ہے، اُس کا سایہ میرے سر پر دیر تک قائم رہے گا ـــــــ اور وہ تو ہر وقت میرے لئے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت دے"

میں نے اُس سے کہا " خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے ـــــــ پر میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی ہے یا نہیں؟ ـــــــ دیکھو جھوٹ نہیں بولنا"

امین پہلوان نے بڑے تیز لہجے میں کہا: ـــــــ میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا ـــــــ میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی"

میں نے پوچھا " کیوں؟"

اُس نے جواب دیا " اس لئے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں"

میں خاموش ہو رہا۔

تیسرے روز اس کی ماں پر فالج گرا، اور وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔ امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا، وہ سوگوار مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک رئیس کی طرف سے اُسے بلاوا آیا ـــــــ وہ اپنی عزیز ماں کی میّت چھوڑ کر اس کے پاس گیا، اور اس سے پوچھا کیوں میاں صاحب، آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

میاں صاحب نے کہا "تمہیں کیوں بلایا جاتا ہے؟ ——— ایک خاص کام ہے۔

آہن نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا، پوچھا "حضور! یہ خاص کام کیا ہے؟"

میاں صاحب نے سگریٹ سلگایا "بلیک مارکٹ کا قصہ ہے ——— مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپہ مارا جائے گا، سو میں نے سوچا کہ آہن پہلوان بہترین آدمی ہے، جو اس کو نمٹا سکتا ہے۔"

آہن نے بڑے مغموم اور زخمی انداز میں کہا "آپ فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"بھئی خدمت ودمت کی بات تم مت کیا کرو ——— بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپہ پڑے تو گودام کے مالک تم ہوگے ——— گرفتار ہو جاؤ گے ——— زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہوگا ——— اور ایک دو برس کی قید۔"

"مجھے کیا ملے گا؟"

"جب وہاں سے رہا ہو کر آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا۔"

آہن نے میاں صاحب سے کہا "حضور! یہ بہت دور کی بات ہے ——— جرمانہ تو آپ ادا کر دیں گے ——— لیکن قید تو مجھے کاٹنی پڑیگی ———

آپ باقاعدہ سودا کریں ۔"

میاں صاحب مسکرائے "تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے؟ ــــــ پچھلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تم کو تین مہینے کی قید ہوئی، تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہم نہ پہنچائی ــــــ تم نے باہر آکر مجھ سے کہا کہ وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں تھی ــــــ اگر اب تم کچھ عرصے کے لیے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں ہر آسائش ہوگی۔"

امین نے کہا "جی، یہ سب درست ہے ــــــ لیکن ــــــ؟"

"لیکن کیا؟"

امین کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میاں صاحب، میری ماں مر گئی ہے۔"

"کب؟"

"آج صبح۔"

"میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا "کفنا دفنا دیا ہوگا۔"

امین کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے "میاں صاحب، ابھی تو کچھ بھی نہیں ہو سکا ــــــ میرے پاس تو افیم کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں۔"

میاں صاحب نے چند لمحات حالات پر غور کیا اور آمین سے کہا۔ "تو ایسا کرو ——— میرا مطلب ہے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست میں ابھی کئے دیتا ہوں ——— تمہیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیئے ——— تم گودام پر جاؤ اور اپنی ڈیوٹی سنبھال لو۔"

آمین نے اپنی قمیض کی میلی آستین سے آنسو پونچھے۔ "لیکن میاں صاحب ——— میں ——— میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دوں۔"

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "یہ سب رسمی چیزیں ہیں ——— مرحومہ کو دفنانا ہے ——— سو یہ کام بڑی اچھی طرح ہو جائیگا ——— تمہیں جنازے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے ——— تمہارے ساتھ جانے سے مرحومہ کو کیا راحت پہنچے گی ——— وہ تو بیچاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے ——— اس کے جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے ——— کیا فرق پڑتا ہے ——— اصل میں تم لوگ جاہل ہو ——— میں اگر مرجاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے جنازے میں کس کس عزیز اور دوست نے شرکت کی تھی ——— مجھے آگ جلا بھی دیا جائے، تو کیا فرق پڑتا ہے ——— میری لاش کو چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے اس کی کیا خبر ہوگی ——— تم زیادہ جذباتی نہ بنو ——— دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق

سوچا جائے ــــــــ میں یہ پوچھتا ہوں، تمہاری کمائی کے ذریعے کیا ہیں؟"

امین سوچنے لگا ــــــــ چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اُس نے جواب دیا "حضور ــــــــ میری کمائی کے ذریعے آپ کو معلوم ہیں ــــــــ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟"

میاں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں میرا کام کرنے میں کیا حیل و حجت ہے ــــــــ میں تمہاری ماں کے تجہیز و تکفین کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں ــــــــ اور جب تم جیل سے واپس آؤ گے تو ــــــــ"

امین پہلوان نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا "تو آپ میرا ابھی بندوبست کر دیں گے"

میاں صاحب بوکھلا گئے "تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان ــــــــ"

امین نے ذرا درشت لہجے میں کہا "امین پہلوان کی ایسی کی تیسی ــــــــ آپ یہ بتائیے کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے ــــــــ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا"

"ایک ہزار تو بہت زیادہ ہے"

امین نے کہا "زیادہ ہے یا کم ــــــــ میں کچھ نہیں جانتا ــــــــ میں جب قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پختہ بناؤں گا ــــــــ سنگِ مرمر

کی ——— وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی "

میاں صاحب نے اُس سے کہا "اچھا بھئی ایک ہزار ہی لے لینا"

امین نے میاں صاحب سے کہا۔ تو لائیے، اتنے روپے دیجئے کہ میں کفن دفن کا انتظام کرلوں ——— اس کے بعد میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہو جاؤں گا"

میاں صاحب نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا "لیکن تمہارا کیا بھروسہ ہے؟"

امین کو یوں محسوس ہُوا، جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے "میاں صاحب آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں؟ ——— بے ایمان آپ ہیں۔ اس لئے کہ اپنے فعلوں کا بوجھ میرے سر پر ڈال رہے ہیں"

میاں صاحب موقع شناس تھے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ امین بگڑ گیا ہے چنانچہ اُنہوں نے فوراً اُسے اپنی چرب زبانی سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن امین پر کوئی اثر نہ ہُوا"

جب وہ گھر پہنچا، تو دیکھا کہ غسال اس کی ماں کو آخری غسل دے چکے ہیں۔ کفن بھی پہنایا جا چکا ہے ——— امین بہت متحیّر ہُوا کہ اُس پر یہ مہربانی کس نے کی ہے؟ ——— میاں صاحب نے؟ ———

لیکن وہ تو سودا کرنا چاہتے تھے۔

اُس نے ایک آدمی سے جو تابوت کو سجانے کیلئے پھول گوندھ رہا تھا پوچھا۔ "یہ کس آدمی نے اتنا اہتمام کیا ہے"

پھول والے نے جواب دیا "حضور! آپ کی بیوی نے"

ایپن چکرا گیا ——— وہ اپنے شدید تعجب کا مظاہرہ کرتا۔ مگر خاموش رہا ——— پھول والے سے صرف اتنا پوچھا "کہاں ہیں وہ؟

پھول والے نے بو ، دیا "جی اندر ہیں ——— آپ کا انتظار کر رہی تھیں"

ایپن اندر گیا ——— تو دیکھا کہ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی اس کی چارپائی پر بیٹھی ہے ——— ایپن نے اس سے پوچھا "آپ کون ہیں؟ ——— یہاں کیوں آئی ہیں؟"

اس لڑکی نے جواب دیا "میں آپ کی بیوی ہوں ——— یہاں کیوں آئی ہوں ——— یہ آپ کا عجیب و غریب سوال ہے؟"

ایپن نے اُس سے پوچھا "میری بیوی تو کوئی بھی نہیں ——— بتاؤ تم کون ہو؟"

لڑکی مسکرائی: "میں ـــــــ میاں ـــــــ دینو کی بیٹی ہوں ـــــــ اُن سے جو آپ کی گفتگو ہوئی، میں نے سب سُنی ـــــــ اور ـــــــ اور"

آمین نے کہا: "اب اور کہنے کی ضرورت نہیں"

* * *

تپش کاشمیری

مجھے ان کا اصل نام ابھی تک معلوم نہیں، حالانکہ میں ان کو بارہ برس سے جانتا ہوں۔ سات برس تو ہم اکٹھے ایک ساتھ رہے۔ دراصل اُن کا نام پوچھنے کی مجھے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ تپش کاشمیری کافی تھا۔ وہ اس نام سے مشہور تھے۔

تپش کاشمیری عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ جب وہ لاہور میں تھے تو ضلع کچہری کی ایک عدالت میں اہلمد تھے۔ آپ نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا تو آپ پیادہ ہو گئے۔ اس ترقیٔ معکوس کا اُن پر کچھ اثر نہ ہُوا، وہ ہر حالت میں خوش رہتے تھے۔

جس مجسٹریٹ سے وہ منسلک، اس کی ہر روز ہجو لکھتے اور کاغذ اُس

کے میز پر رکھ آنے، وہ چیختا چلاتا، مگر تپش صاحب خاموش رہتے جیسے ان کو کسی بات کا علم ہی نہیں۔ فی البدیہ شعر کہنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے بمبئی میں ایک ناگپوری شاعر نے جو بزعمِ خود فی البدیہ شعر کہنے میں مولینا ظفر علی خاں سے کئی معرعے آگے تھے، تپش صاحب سے کہا۔ حضرت۔ چلو آج گفتگو شعروں ہی میں ہو۔"

تپش صاحب نے بڑی انکساری کے ساتھ کہا۔" جیسے آپ کی مرضی،" اور ساتھ ہی گفتگو کا آغاز ایک شعر سے کر دیا، ناگپوری شاعر سٹ پٹا گئے، اور ذہن پر زور دے کر تپش صاحب کے اس شعر کا جواب شعر میں فکر کرنے لگے۔

تپش صاحب نے فوراً ایک اور شعر گھڑ کر ان سے پوچھا کہ جناب دیر کیوں لگا رہے ہیں، جلدی گفتگو شروع کیجئے۔

ناگپوری شاعر بوکھلا گیا۔ میرا خیال ہے اُن کے اس استفسار سے اُس کے دماغ سے وہ سب کچھ نکل گیا۔ جو اس نے بڑی محنت سے سوچا تھا۔ تپش صاحب نے اس پر تین چار شعر اور چست کر دیئے اور وہ بیچارہ ناگپوری چاروں شانے چت ہو گیا

میں یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تپش صاحب کی شاعری میں کوئی جان نہیں۔ یوں تو ان کا ہر شعر بڑا اچھا تلا ہوتا ہے، عروض کی کوئی خامی

نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھرم کانٹے میں تل کر آیا ہے، بڑی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں، اور قریب قریب ہر روز دو تین غزلیں یا نظمیں فی البدیہہ لکھتے ہیں، لیکن شاذ و نادر اُن کے قلم سے کوئی ایسا شعر نکلتا ہے جو صحیح معنوں میں شعر کہلانے کا مستحق ہو۔

اُنہوں نے بلا مبالغہ دس بارہ لاکھ شعر لکھے ہوں گے۔ مگر ان کو وہ باعثِ افتخار نہیں سمجھتے۔ وہ خود کو بھی شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے، ان کو اپنی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ اور بیان کروں، میں تپش صاحب کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں چند اور باتیں بھی بتانا چاہتا ہوں، جو بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔

ایک زمانہ تھا وہ لاہور کے ضلع کچہری میں ملازم تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ان کو اسلامیہ اسکول کے ایک لڑکے سے عشق ہوگیا۔ بڑا افلاطونی قسم کا، اُن کو معلوم ہُوا کہ یہ لڑکا نماز پڑھتا ہے، صبح سویرے اپنے محلے کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے جاتا ہے ——— یہ معلومات حاصل ہوتے ہی آپ صبح تین بجے اُٹھتے، سخت سردیوں کا موسم تھا، مسجد میں جاکر جھاڑو دیتے پھر ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کرتے اور اذان دینا شروع کر دیتے۔ مسجد کا مُلّا جو بہت بڈھا اور سُست تھا، اپنے حُجرے میں چونک پڑتا کہ یہ اذان کون دے رہا ہے، جب

تک وہ اُٹھ کر باہر نکلتا، تپش صاحب نے امامت شروع کر دی ہوتی تھی۔ وہ لڑکا اُن کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوتا۔ اس سے اُن کو بڑی روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی ـــــــ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔

ایک مرتبہ اس لڑکے کی سائیکل خراب ہو گئی۔ اُس نے اپنے نوکر کو دی کہ ٹھیک کرا لائے۔ تپش صاحب نے دیکھ لیا اور سائیکل نوکر سے لیکر ایک دکان پر لے گئے۔ اُس کے تمام پُرزے علیحدہ کروئے مٹی کے تیل میں ڈبو کر ان کو صاف کیا۔ دکاندار سے جو اُن کا دوست تھا، کپڑا مانگا کہ وہ انہیں خشک کریں، مگر اس کے پاس نہیں تھا، چنانچہ تپش صاحب نے اپنی نئی بوسکی کی قمیض اتاری، اس کو پھاڑا، اور تمام پرزوں پر سے تیل خشک کر کے ان کو خوب چمکایا۔ جب سائیکل ٹھیک ہو گئی تو اس لڑکے کے نوکر کے حوالے کر دی اور کہا، "دیکھو، بابو جی سے مت کہنا کہ میں نے ٹھیک کی ہے"۔

اس لڑکے کی دوستی اسی دوران میں اپنے ایک ہم جماعت سے ہو گئی۔ تپش صاحب کو اس کا اتنا دکھ ہوا کہ نیم پاگل سے ہو گئے۔ داڑھی بڑھا لی۔ سخت گرمیاں تھیں۔ مگر آپ اوورکوٹ پہنتے تھے۔ سر پر پانامہ سیٹ اور چھینٹ کی نیکر کمر بند ـــــــ پاؤں میں فل بوٹ ـــــــ لیکن ان کی باتیں جب بھی غیر متوازن نہیں ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں انہوں نے اُس لڑکے کے بارے میں بے شمار شعر کہے، جو شعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ ان میں تپش صاحب کے دل کو جو ٹھیس پہنچی تھی، اس کا صاف پتہ چلتا ہے، ان میں درد ہے۔ کسک ہے اور افلاطونی عشق کی تمام گہرائیاں بھی موجود ہیں۔

یوں بھی تپش صاحب کو دنیوی معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن اس حادثے کے بعد وہ بالکل بے نیاز ہو گئے، کھانا مِلا ہے تو کھالیا، نہیں ملا تو کوئی پرواہ نہیں۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہم لاہور کے حاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے تپش صاحب کھانا کھا چکے تھے، لیکن مجھے کھانا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں اُن کے چند دوست آئے جو پاس والے میز پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے تپش صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا "آیئے، کھانا تناول فرمایئے۔"

تپش صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ "خدا آپ کو بہت بہت دے ——— میں گھر سے کھا کر آیا ہوں۔"

ان کے دوست نے بڑا اصرار کیا کہ وہ ضرور کھائیں۔ آخر تنگ آکر وہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور بارہ روٹیوں اور سالن کی دو بڑی پلیٹوں کا آرڈر دیا۔ یہ کھا چکے تو چار روٹیاں اور ایک پلیٹ سالن کی اور منگوائی۔ اس کے

بعد فیرنیا کی چار پلیٹیں کھائیں اور خدا کا شکر ادا کر کے وہاں سے اُٹھے اور میرے پاس چلے آئے ـــــــــ اُن کے اُس دوست کی حالت قابلِ رحم تھی، جس نے از راہِ تکلف ان کی دعوت دی تھی۔ وہ بالکل مبہوت تھا، وہ شاید اس لمحے پر لعنتیں بھیج رہا تھا۔ جب اُس نے تیش صاحب سے کہا "آیئے، کھانا تناول فرمایئے!"

میرا خیال ہے کہ تپش صاحب میں ذائقے کی حس موجود نہیں تھی، وہ ہر چیز کھا سکتے تھے۔ تھوہر اور کیلے میں اُن کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا کچے چاول ہوں، یا اُبلے ہوئے، تازہ ہو یا پانچ چھ روز کی باسی، اُن کے لئے ایک جیسی تھی۔

میں نے کبھی اُن کو کسی چیز کے بارے میں شکایت کرتے نہیں سنا۔ جو مل جائے، ٹھیک ہے ـــــــــ لیکن حیرت ہے کہ اس قسم کی طبیعت کا مالک، جو فالودے میں کھیر، نمکین چائے اور نیلوفر کا شربت ملا کر پی جاتا ہے، تمام سبزیاں پتوں اور ڈنٹھوں سمیت کھاتا ہے۔ ایک ایک پاؤ سرخ مرچیں پھانک جاتا ہے، اپنی صحت کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔

ان کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی۔ سرخ رنگت، سر کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں سات آٹھ برس

بڑے تھے۔ یعنی چھیالیس سینتالیس برس کے لگ بھگ تھے، مگر ان کے مقابلے میں میں بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ میرے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔

تپش صاحب کو عورتوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ صنفِ نازک سے صنفِ کرخت کو کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ شیشے کا رشتہ پتھر سے غیر فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو جس کو انہوں نے کبھی گھر میں بسایا ہی نہیں تھا۔ آخر طلاق دے کر آزاد کر دیا۔

جب میرے بلانے پر بمبئی آئے تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر آئے تھے۔ مجھ سے انہوں نے اس بات کا ذکر بہت دیر بعد میں کیا۔ کیونکہ اُنکے خیال کے مطابق یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن اس کا ردِ عمل اُن پر اس صورت میں نمودار ہوا کہ انہوں نے با قاعدہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔ مگر اُن کی تلاوت کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔

میں نے ایک روز دیکھا کہ وہ صبح سویرے اُٹھے، غسل کیا اور الف ننگے بدن خشک کئے بغیر کرسی پر بیٹھ گئے۔ حمائل شریف نکالی اور تلاوت شروع کر دی۔ ایک پارہ پڑھا، کپڑے پہنے اور باہر نکلے۔ میں حیرت میں گم تھا کہ

آخر یہ سلسلہ کیا ہے ــــــ کہیں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا، لیکن میرا شک غلط ثابت ہوا، باہر نکل کر انہوں نے ٹرام کے ایک ٹکٹ پر نظم لکھی۔ مجھ سے بڑی پُر مغز گفتگو کی۔ میری زبان کی چند غلطیوں کی طرف میری توجہ دلائی میرے دماغ میں چونکہ بڑی کھُدبُد ہو رہی تھی۔ اس لئے میں اُن سے پُوچھے بغیر نہ رہ سکا "تپش صاحب ــــــ آپ ننگے ــــــ ننگے بدن قرآن مجید کی تلاوت کیوں کرتے ہیں ــــــ کیا یہ معیوب نہیں؟"

تپش صاحب مُسکرائے "قرآن میں کہیں بھی یہ حکم صادر نہیں کیا گیا۔ کہ آدمی تینوں کپڑے پہن کر اُس کی تلاوت کرے ــــــ میں اس لئے کپڑے نہیں پہنتا کہ مبادا ان میں کوئی گندگی کی آلائش ہو ــــــ نہانے کے بعد میں تولیے سے اپنا بدن بھی اِسی لئے خشک نہیں کرتا"

عجب منطق تھی۔ بہر حال میں خاموش رہا۔ کیونکہ اُن سے بات کرنا ایک اچھی خاصی طویل بحث کا آغاز کرنا تھا۔

اِسی دَوران میں انہیں تپ محرقہ ہو گیا ــــــ میں نے ڈاکٹر بلایا ــــــ سولہ روپے اُس کی فیس ادا کی، مگر تپش صاحب نے اس ڈاکٹر سے بڑے کرخت لہجے میں کہا "صاحب، آپ کو یہاں کس نے بلایا ہے ــــــ مجھے معلوم ہے کہ میرا عارضہ کیا ہے، اور مجھے اس کا علاج بھی معلوم ہے ــــــ آپ تشریف لے جایئے"

ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے۔ تپش صاحب نے اکیس دن فاقہ کشی کی، کچھ کھایا، نہ پیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا "میں اب بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں ——— نوکر کو چوپاٹی بھیجو اور آٹھ آنے کا رگڑا منگواؤ ——— ڈھیر ساری مرچیں ہوں ———"

رگڑا بمبئی کی زبان میں چاٹ کو کہتے ہیں، یعنی آلو چھولے" ———

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ خوفناک چیزیں منگواؤں یا نہ منگواؤں۔ مگر تپش صاحب کے آگے کیا پیش چل سکتی تھی، آخر میں نے نوکر کو چوپاٹی بھیجا اور رگڑا منگوایا جو تپش صاحب نے سب کا سب کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں اتنی مرچیں اور اتنی کھٹائی تھی، جو بیس بائیس آدمیوں کو بھی پیچش یا اسہال معدہ کے مرض میں گرفتار کر دیتیں لیکن تعجب ہے کہ دوسرے روز وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں تپ محرقہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا ——— میں نے جب اپنی حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھ سے کہا "برادرم ——— ہر بیماری کے لئے علاج ہوتے ہیں ——— ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنے مرض کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم ہی سے کرائے ——— خدا نے ہر آدمی کو اپنے عوارض دور کرنے کی ودیعت فرمائی ہے ——— وہ اگر اس سے کام لے تو ڈاکٹروں اور طبیبوں کی ضرورت ہی نہیں "

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے ۔ اُن کا رنگ جو کسی قدر پیلا ہو گیا تھا، چند روز میں رگڑا کھا کھا کر پھر وہی سرخی اختیار کر گیا۔ آپ نے پھر اُسی طرح ہر روز نظمیں اور غزلیں کہنا شروع کر دیں ——— مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوئے ۔

بہت دن گذر گئے ——— میرا مطلب ہے، قریب قریب ڈھائی مہینے کا عرصہ بیت گیا۔ اس کے بعد ایک دن اچانک تپش صاحب نے مجھ سے کہا "میں آپ کے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا "

میں نے حیرت سے پوچھا "کیوں ؟"

"کسی دوست کو زیادہ دیر تک تکلیف دینا نہیں چاہیئے "

میں نے ان سے کہا "مجھے کوئی تکلیف نہیں ——— آپ محض تکلف کر رہے ہیں "

تپش صاحب جس بات کا تہیہ کریں، بالآخر وہ پوری ہوتی ہے، چنانچہ وہ اپنا چھوٹا سا ٹین کا بکس اٹھا کر میرے گھر سے چلے گئے ——— معلوم نہیں کہاں ۔

اگر انہوں نے اپنے ٹھکانے کے متعلق مجھے کچھ بتایا ہوتا تو میں یقیناً ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور ملتا ——— مگر وہ اس افراتفری میں گئے، کہ میں اُن سے کچھ پوچھ بھی نہ سکا ۔

ایک دن وہ خود آئے، خلافِ معمول نیا سوٹ پہنا ہُوا تھا۔ بالوں میں تیل بھی تھا۔ مجھ سے ملتے ہی کہنے لگے "برادرم ———— مجھے افسوس ہے کہ میں اِتنے عرصے تک تمہارے پاس نہ آسکا ———— مجھے عشق ہوگیا تھا اور اصل "

میں چکرا گیا ———— تپش صاحب اور عشق ———— کیا اُس لاہوری لڑکے کا کوئی نعم البدل بمبئی میں پیدا ہوگیا ہے ؟ ۔

تپش صاحب نے مجھے زیادہ دیر تذبذب میں نہ رکھا اور اپنے عشق کی روداد سُنا دی۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ انہیں ایک لڑکی سے عشق ہوا تھا۔

یہ لڑکی ایک مجاور کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ تپش صاحب وکٹوریہ گارڈن میں اس کو اپنے ساتھ لائے اور مجھے مجبور کیا کہ اُس کا فوٹو اُتارا جائے چنانچہ اُن کے احکام کے مطابق میں اپنے ایک دوست سے کیمرہ لے کر پہنچا ———— لڑکی خوبصورت تھی۔ بڑی آبرو قسم کی۔ تپش صاحب سے بہت جھینپتی تھی۔ اس سے زیادہ مجھ سے ———— اور اس سے بھی زیادہ اِرد گرد کے ماحول سے،

خیر میں نے چار پانچ پوز لئے اور وکٹوریہ گارڈن میں ان دونوں کو چھوڑ کر گھر چلا آیا ———— میرا دل و دماغ بہت مضطرب تھا۔ میرے

قیاس میں کبھی یہ چیز آ ہی نہیں سکتی تھی کہ تپش کاشمیری صاحب کبھی کسی عورت سے دلچسپی لیں گے۔ لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، وہ اس لڑکی سے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، والہانہ محبت کرتے تھے۔

میں نے ایک روز ان سے کہا "تپش صاحب اتنی دیر ہو گئی ہے —— آپ اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے"

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "میں روپیہ جمع کر رہا ہوں۔ اُس کے باپ سے تمام باتوں کا فیصلہ ہو چکا ہے —— میں نے اُس کے بھائی کے لئے ایک سوٹ بنوا دیا ہے —— باپ کو بھی کچھ روپے دے چکا ہوں، اس لئے کہ اُس کے پاس شادی کے اخراجات کے لئے کچھ بھی نہیں —— ایک صوفہ سیٹ، ایک ڈریسنگ ٹیبل اور چار کرسیاں بھی خرید کر اس کے باپ کے حوالے کر دی ہیں —— میں چاہتا ہوں، شادی کے بعد ان ہی کے ساتھ رہوں —— وہ اُداس نہیں ہو گی۔

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھا اور نیک خیال ہے"

تپش صاحب ذرا پھول سے گئے "میں حرام کاری کا قائل نہیں —— اُس سے باقاعدہ عقد کرنا چاہتا ہوں"

میں نے اُن سے اُس خدشے کا ذکر کیا جو اچانک میرے دماغ میں پیدا

ہو گیا تھا "ہو سکتا ہے ـــــــ کوئی اور ـــــــ میرا مطلب ہے کوئی اور آپ پر بازی لے جائے"!

تپش صاحب کے گال اور زیادہ سرخ ہو گئے "کون بازی لے جا سکتا ہے، مجھ پر ـــــــ میں شاعر ہوں، لیکن اول درجے کا غنڈہ بھی ہوں ـــــــ میں قلم کے علاوہ لٹھ سے بھی کام لینا جانتا ہوں"!

تپش صاحب گھر بنانے کی فکر میں مصروف تھے کہ اس لڑکی کا معاشقہ ایک نوجوان پہلوان سے ہو گیا ـــــــ اسی دوران میں لڑکی کے باپ کو ہیضہ ہوا، اور وہ دو دن کے بعد راہیٔ ملکِ عدم ہوا ـــــــ تپش صاحب نے اُس کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔ بڑے احترام سے اس کو دفن کیا ـــــــ!

چوتھے روز اُنہیں معلوم ہوا کہ لڑکی اُس نوجوان پہلوان کے ساتھ بھاگ گئی ہے ـــ یہ انہیں جبھی اُس وقت معلوم ہوا جب وہ کھیت واڑی اسٹریٹ سے نکلے تھے۔ تپش صاحب نے سائیکل کرائے پر لی اور اُس موٹر کا تعاقب کیا۔ جس میں پہلوان اس لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔

تپش صاحب نے اُن کو پکڑ لیا ہوتا۔ مگر ان کی سائیکل ایک وکٹوریہ گاڑی کی جھپٹ میں آ گئی۔ آپ بہت بری طرح زخمی ہوئے۔

دائیں کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ——— دوستوں نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ چوٹ اتنی انتہا انداز ہوئی۔ کہ وہ کئی دن بیہوش رہے ——— ان کا بازو پلاسٹک میں بندھا تھا۔ ہلنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ پر جب انہیں ذرا سا ہوش آیا۔ تو انہوں نے یہ ٹھانی کہ ہسپتال سے کسی نہ کسی طریقے سے باہر نکلنا چاہیئے۔

جنرل وارڈ میں تھے۔ جب دیکھا کہ ڈاکٹر کھانا کھانے گئے ہیں تو وارڈ سے نکل آئے۔ اور سیدھے میرے پاس آئے اور کہا "مجھ سے فضول باتیں مت پوچھنا ———"

میں نے ان سے کوئی فضول بات نہ پوچھی ——— لیکن ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا "میں اب کیا کروں"

اب اس کا جواب میرے پاس کیا ہو سکتا تھا ——— میں نے صرف اتنا کہا "تپش صاحب آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں ——— میں بہت کم عقل ہوں۔

تپش صاحب، میرا یہ جواب سن کر چند لمحات خاموش رہے۔ اس کے بعد کہا "ٹھیک ہے ——— ہر شخص اپنے معاملات اچھی طرح جانتا ہے"

دوسرے دن انہوں نے زنانہ لباس پہننا شروع کر دیا ——— وہی کپڑے تھے جو انہوں نے اس لڑکی کے لئے بنوائے تھے۔

———*———

رِشوت

احمد دین اچھے کھاتے پیتے آدمی کا لڑکا تھا اپنے ہم عمر لڑکوں میں سب سے زیادہ خوش پوش مانا جاتا تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بالکل خستہ حال ہو گیا۔

اُس نے بی۔ اے کیا اور اچھی پوزیشن حاصل کی۔ وہ بہت خوش تھا ——— اس کے والد خان بہادر عطاء اللہ کا ارادہ تھا کہ اُسے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجیں گے۔ پاسپورٹ لے لیا گیا تھا، سُوٹ وغیرہ بھی بنوالئے گئے تھے۔ کہ اچانک خان بہادر عطاء اللہ نے جو بہت شریف آدمی تھے۔ کسی دوست کے کہنے پر سٹہ کھیلنا شروع کر دیا۔

شروع میں اُنہیں اس کھیل میں کافی منافع ہوا۔ وہ خوش تھے۔ کہ چلو میرے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ ہی نکل آیا۔ مگر لالچ بُری بلا ہے اُنہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی قسمت پر چڑھ گئی ہے ——— جیت تے ہی چلے جائیں گے۔ اُن کا وہ دوست جس نے اُن کو اِس راستے پر لگایا تھا، بار بار اُن سے کہتا تھا "خان صاحب، ماشاءاللہ آپ قسمت کے دھنی ہیں ——— مٹی میں بھی ہاتھ ڈالیں تو سونا بن جائے"

اور وہ اس قسم کی چاپلوسیوں کے ذریعے خان بہادر سے سو دو سو روپے اینٹھ لیتا۔ خان بہادر کو بھی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ اس لئے کہ انہیں بغیر محنت ہزاروں روپے مل رہے تھے۔

احمد دین ذہین اور باشعور لڑکا تھا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے کہا "اباجی، یہ آپ نے جو سٹہ بازی شروع کی ہے، معاف کیجئے گا، اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا"

خان بہادر مسکرائے "میں نیک و بد تم سے بہتر جانتا ہوں"

"درست ہے ——— لیکن ———"

خان بہادر نے تیز لہجے میں اُس سے کہا "برخوردار تمہیں میرے کاموں میں دخل دینے کی جراءت نہیں ہونی چاہیئے ——— میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے جتنا روپیہ آ رہا ہے وہ میں اپنے ساتھ قبر میں لیکر نہیں

جاؤں گا ——— یہ سب تمہارے کام آئے گا۔"

احمد دین نے بڑی معصومیت سے پوچھا "لیکن ابا جی یہ کب تک آتا رہے گا ——— ہو سکتا ہے، کل کو جانے بھی لگے۔"

خان بہادر بھنا گئے "بکومت ——— آتا ہی رہے گا۔"

روپیہ آتا رہا ——— لیکن ایک روز خان بہادر نے کئی ہزار روپے کی رقم داؤ پر لگا دی ——— لیکن نتیجہ صفر نکلا ——— دس ہزار ہاتھ سے دینے پڑے۔

تاؤ میں آ کر انہوں نے بیس ہزار روپے کا سٹہ کھیلا ——— اُن کو یقین تھا کہ ساری کسر پوری ہو جائے گی ——— لیکن صبح جب انہوں نے اخبار دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ بیس ہزار بھی گئے۔

خان بہادر ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنا ایک مکان گروی رکھ کر پچاس ہزار روپے لئے۔ اور سب کے سب اللہ کا نام لے کر چاندی کے سٹے پر لگا دئے۔

اللہ کا نام تو خیر اللہ کا نام ہے ——— وہ چاندی اور سونے کی مارکیٹ پر کیا کنٹرول کر سکتا ہے ——— صبح ہوئی تو خان بہادر کو معلوم ہُوا کہ چاندی کا بھاؤ ایک دم گر گیا ہے ——— ان کو اس قدر صدمہ ہُوا کہ دل کے دورے پڑنے لگے۔

احمد دین نے اُن سے کہا۔ ”ابا جی ـــــ چھوڑ دیجئے اس بکواس کو۔“

خان بہادر نے بڑے غصّے میں اپنے بیٹے سے کہا ”تم بکواس مت کرو ـــــ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔“

احمد دین نے دوبارہ کہا ”لیکن ابا جان، یہ جو آپ کو دل کی تکلیف شروع ہو گئی ہے ـــــ اس کی وجہ کیا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم ـــــ اللہ بہتر جانتا ہے ـــــ ایسے عارضے انسان کو ہوتے ہی رہتے ہیں۔“

احمد دین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”جی ہاں ـــــ انسان کو ہر قسم کے عارضے ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے ـــــ مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی چیز کھائیں جس میں ہیضے کے جراثیم ہوں ـــــ اور ـــــ“

خان بہادر کو اپنے بیٹے کی یہ گفتگو پسند نہیں تھی: ”تم چلے جاؤ یہاں سے ـــــ میرا مغز مت چاٹو ـــــ میں ہر چیز سے واقف ہوں۔“

احمد دین نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا: ”یہ آپ کی غلط فہمی ہے ـــــ کوئی انسان بھی ہر چیز سے واقف ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا

احمد دین چلا گیا۔ خان بہادر اندرونی طور پر خود کو بہت بڑا چُغد سمجھنے لگے تھے، لیکن وہ اپنے اس احساس کو اپنے لڑکے پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے ——— بستر پہ لیٹے انہوں نے بار بار خود سے کہا "خان بہادر عطاء اللہ ——— تم خان بہادر بنے پھرتے ہو ——— لیکن اصل میں تم اول درجے کے بیوقوف ہو"

"تم اپنے بیٹے کی بات پر کان کیوں نہیں دھرتے، جبکہ تم جانتے ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح ہے"

"جتنا روپیہ تم نے حاصل کیا تھا، اُس سے دوگنا زیادہ تم ضائع کر چکے ہو ——— کیا یہ درست ہے"

خان بہادر جھنجلا گئے اور بڑبڑانے لگے "سب درست ہے ——— سب درست ہے ——— ایک میں ہی غلط ہوں ——— لیکن، میرا غلط ہونا ہی صحیح ثابت ہوگا بعض اوقات غلطیاں بھی صحت کا سامان مہیا کر دیتی ہیں ———"

پندرہ دن بستر پہ لیٹے اور علاج کرنے کے بعد جب وہ کسی قدر تندرست ہوئے تو اُنہوں نے اپنا ایک اور مکان بیچ دیا۔ یہ پچیس ہزار میں بکا ——— خان صاحب نے یہ سب روپے سٹے پر لگا دیئے۔ اُن کو پوری پوری اُمید تھی کہ وہ اپنی اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر لیں گے۔ مگر قسمت نے

یاوری نہ کی، اور وہ ان پچیس ہزار روپلوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

احمد دین پیچ تاب کھا کے رہ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے باپ کو کس طرح سمجھائے، وہ اُس کی کوئی بات سُنتے ہی نہیں تھے۔

احمد دین نے آخری کوشش کی اور ایک دن جب اُس کا باپ اپنے کمرے میں حقہ پی رہا تھا اور معلوم نہیں کس سوچ میں غرق تھا کہ وہ اُس سے ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوا "ابا جی!"

خان بہادر صاحب سوچ میں اس قدر غرق تھے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی آواز ہی نہ سُنی۔

احمد دین نے آواز کو ذرا بلند کیا "ابا جی ——— ابا جی"

خان بہادر چونکے "کیا ہے؟"

احمد دین کانپ گیا "کچھ نہیں ابا جی ——— مجھے ——— مجھے آپ سے ایک بات کہنا تھی۔"

خان بہادر نے حقے کی نڑی اپنے منہ سے جدا کی "کہو کیا کہنا ہے؟"

احمد دین نے بڑی لجاجت سے کہا "مجھے یہ عرض کرنا تھا۔ آپ سے یہ درخواست کرنا تھی ——— کہ ——— آپ سٹہ کھیلنا بند کر دیں۔"

حقے کا ایک زور کا کش لے کر وہ احمد دین پر برس پڑے "تم کون ہوتے ہو، مجھے نصیحت کرنے والے ـــــــ میں جانوں میرا کام ـــــــ کیا اب تک تمہارے ہی مشورے سے میں سارے کام کرتا رہا ہوں ـــــــ دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ میرے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا ـــــــ مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں ـــــــ سمجھے؟"

احمد دین کی گردن جھکی ہوئی تھی "جی میں سمجھ گیا" اور یہ کہہ کر وہ اپنے باپ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سٹے کی لت شراب کی عادت سے بھی کہیں زیادہ بری ہوتی ہے ـــــــ خان بہادر اس میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے، کہ چھٹکارے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی تھی ـــــــ جتنی غیر منقولہ جائیداد تھی۔ سب کی سب اس خطرناک کھیل کی نذر ہو گئی ـــــــ مرحوم بیوی کے زیور تھے، وہ بھی گئے ـــــــ اور نتیجہ اُس کا یہ نکلا کہ ان کے دل کے عارضے نے کچھ ایسی شکل اختیار کی کہ وہ ایک روز صبح سویرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی دھم سے گرے اور ایک سکینڈ کے اندر اندر دم توڑ دیا۔

احمد دین کو ظاہر ہے کہ اپنے باپ کی وفات کا بہت صدمہ پہنچا ـــــــ

وہ کئی دن نڈھال رہا ——— اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ کیا کرے ——— بی۔ اے پاس تھا ——— اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا ——— مگر سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا، اُس کے باپ نے ایک پھوٹی کوڑی بھی اُس کے لئے نہیں چھوڑی تھی ——— مکان جس میں وہ تن تنہا رہتا تھا ——— رہن تھا۔

یہاں سے اُس کو کچھ عرصے کے بعد نکلنا پڑا۔ گھر کی مختلف چیزیں بیچ کر اس نے چار پانچ سو روپے حاصل کئے اور ایک غلیظ محلے میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔

مگر پانچ سو روپے کب تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ ایک برس تک بڑی کفایت شعاری سے گزارہ کر لیتا ——— لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟

احمد دین نے سوچا "مجھے ملازمت کر لینی چاہیئے ——— چاہے وہ کیسی بھی ہو ——— پچاس ساٹھ روپے ماہوار مل جائیں، تو گذران ہو جائے گا"

اُس کی ماں کو مرے اُتنے ہی برس ہو گئے تھے، جتنے اُس کو جیتے، احمد دین نے حالانکہ اُس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، نہ اُس کو اس کا دودھ

نصیب ہُوا تھا۔ پھر بھی وہ اکثر اس کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا!

احمد دین نے ملازمت حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی ——— اتنے بے روزگار اور بیکار آدمی تھے کہ وہ خود کو اس بے روزگاری اور بے کاری کے سمندر میں ایک قطرہ سمجھتا تھا ——— لیکن اس احساس کے باوجود اُس نے ہمت نہ ہاری۔ اور اپنی تگ و دو جاری رکھی۔

بہت دنوں کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ اگر کسی افسر کی مٹھی گرم کی جائے تو ملازمت ملنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ مٹھی گرم کرنے کا مصالحہ کہاں سے لاتا۔

ایک دفتر میں جب وہ ملازمت کے سلسلے میں گیا، تو ہیڈ کلرک نے اُس سے بڑے شفیقانہ انداز میں کہا "دیکھو برخوردار، یوں خالی خولی کام نہیں چلے گا ——— جس آسامی کے لئے تم نے درخواست دی ہے، اُس کے لئے پہلے ہی ڈیڑھ سو پچاس درخواستیں وصول ہو چکی ہیں ——— میں بڑا صاف گو آدمی ہوں ——— پانچ سو روپے اگر تم دے سکتے ہو۔ تو یہ ملازمت تمہیں یقیناً مل جائے گی"!

اب احمد دین پانچ سو روپے کہاں سے لاتا۔ اس کے پاس مشکل بیس روپے تھے، چنانچہ اس نے ہیڈ کلرک سے کہا "جناب!

میرے پاس اِتنے روپے نہیں —— آپ ملازمت دلوا دیجئے ——
تنخواہ میں سے آدھی رقم آپ لے لیا کریں"
ہیڈ کلرک ہنسا ۔ "تم ہمیں بیوقوف بناتے ہو —— جاؤ چلتے
پھرتے ہو"
احمد دین بہت دیر تک چلتا پھرتا رہا ۔ مگر اُسے اطمینان سے کہیں
بیٹھنے کا موقعہ نہ ملا —— جہاں جاتا ، رشوت کا سوال سامنے
آن کھڑا ہوتا ۔ اُس نے سوچا کہ یہ ساری دنیا ہی رشوت پر قائم ہے ——
یا رشوت ہی کی وجہ سے عالمِ وجود میں آئی ہے شاید خدا کو کسی
نے رشوت دی ہو ۔ اور اس نے یہ دنیا بنا دی ہو ،
احمد دین کے پاس جب ایک پیسہ بھی نہ رہا تو اس نے مزدوری شروع
کر دی ، بوجھ اُٹھاتا اور ہر روز ایک دو روپے کما لیتا —— مہنگائی کا
زمانہ تھا ۔ گو دونوں وقت کا کھانا بھٹیار خانے میں کھاتا ۔ لیکن اُسے کافی
خرچ برداشت کرنا پڑتا —— زیادہ سے زیادہ ایک آنہ بچ رہتا ۔
احمد دین مزدوری کرتا ۔ مگر اس کے دل و دماغ پر رشوت کا چکر گھومتا
رہتا تھا —— یہ ایک بہت بڑی لعنت تھی ، وہ چاہتا تھا کہ اس سے
کسی طور نجات حاصل کرے —— اور مزدوری چھوڑ کر کوئی ایسی
ملازمت اختیار کرلے جو اُس کے شایانِ شان ہو —— آخر وہ بی ۔ اے

پاس تھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔

اُس نے سوچا کہ نماز پڑھنا شروع کر دے   خدا سے دُعا مانگے
کہ وہ اس کی سُنے چنانچہ اُس نے باقاعدہ پانچ وقت کی نماز شروع کر دی
یہ سلسلہ ایک برس تک جاری رہا، مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہُوا۔

اِس دوران میں اُس کے پاس تیس روپے جمع ہو چکے تھے۔ صبح
کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ڈاک خانے گیا۔ تیس روپے کا پوسٹل آرڈر
لیا اور لفافے میں ڈال کر ساتھ ہی ایک رقعہ بھی رکھ دیا جس کا مضمون
کچھ اس قسم کا تھا:۔

"اللہ میاں —— میں سمجھتا ہوں، تم بھی رشوت لیکر کام کرتے
ہو — میرے پاس تیس روپے ہیں جو تمہیں بھیج رہا ہوں —— مجھے کہیں
اچھی سی ملازمت دلوا دو —— بوجھ اٹھا اٹھا کر میری کمر دوہری ہو گئی ہے

لفافے پر اس نے پتہ لکھا "بخدمت جناب اللہ میاں۔ مالک کائنات"

چند روز کے بعد احمد دین کو ایک خط ملا جو کائنات اخبار کے ایڈیٹر کی
طرف سے تھا۔ اس کا نام محمد میاں تھا۔ خط کے ذریعے اُس نے احمد دین کو بلایا تھا
وہ کائنات کے دفتر میں گیا جہاں اس کو مترجم کی حیثیت سے سو روپیہ
ماہوار پر رکھ لیا گیا — احمد دین نے سوچا — آخر رشوت کام آ ہی گئی۔

قیمے کی بجائے بوٹیاں

ڈاکٹر سعید میرا ہمسایہ تھا، اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ اس کی گراؤنڈ فلور پر اس کا مطب تھا میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا۔ ایک دو گھنٹے کی تفریح ہو جاتی ۔ بڑا بذلہ سنج، ادب شناس اور وضعدار آدمی تھا۔

رہنے والا بنگلور کا تھا، مگر گھر بڑی شستہ و رفتہ اردو میں گفتگو کرتا تھا اس نے اردو کے قریب قریب تمام بڑے شعراء کا مطالعہ کچھ ایسے ہی انہماک سے کیا تھا۔ جس طرح اس نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کورس کی جملہ کتابوں کا میں کئی دفعہ سوچتا کہ ڈاکٹر سعید کو ڈاکٹر بننے کے بجائے کسی بھی مضمون میں ایم۔ اے۔ ایچ۔ پی کی ڈگری حاصل کرنی چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ

اس کی افتاد طبع کے لئے یہ نہایت موزوں و مناسب ہوتی۔ چنانچہ میں نے ایک روز اُس سے کہا "ڈاکٹر صاحب! آپ نے یہ پروفیشن کیوں اختیار کیا؟"

"کیوں؟"

میں نے اُن سے کہا "آپ اردو یا فارسی زبان کے بڑے اچھے پروفیسر ہوتے ——— بڑے ہر دل عزیز ——— طالب علم آپ کے گرویدہ ہوتے۔"

وہ مسکرایا "ایک ہی بات ہوتی ——— نہیں ——— زمین و آسمان کا فرق ہوتا ——— میں یہاں اپنے مطلب میں بڑے اطمینان سے بیٹھا ہر روز کم از کم سو سوا سو روپے بنا لیتا ہوں ——— اگر میں نے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کیا ہوتا، تو مجھے کیا ملتا؟ زیادہ سے زیادہ چھ سات سو روپے۔"

میں نے ڈاکٹر سے کہا "بڑی معقول آمدنی ہے۔"

"آپ اِسے معقول کہتے ہیں ——— سو روپے کے قریب تو میرا اپنا جیب خرچ ہے ——— آپ جانتے ہی ہیں کہ میں شراب پینے کا عادی ہوں اور وہ بھی ہر روز ——— قریب قریب چھپّتر روپے تو اِسی مد پر اُٹھ جاتے ہیں ——— پھر سگریٹ ہیں، دوست یاروں کی تواضع ہے ——— یہ سب خرچ کیا ایک لیکچرار پروفیسر

ریڈر یا پرنسپل کی تنخواہ پورا کر سکتی ہے۔"

میں قائل ہو گیا۔ "جی نہیں —— آپ درست کہتے ہیں —— ویسے میری خواہش تھی آپ ڈاکٹر نہ ہوتے شاعر ہوتے، ادیب ہوتے۔ مصوّر ہوتے ——"

میری بات کاٹ کر انہوں نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "اور فاقہ کشی کرتا۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

ڈاکٹر سعید کے اخراجات واقعی بہت زیادہ تھے۔ اس لئے کہ وہ کنجوس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اُسے اپنے مطب سے فارغ ہو کر فرصت کے اوقات میں دوست یاروں کی محفلیں جمانے میں ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

شادی شدہ تھا۔ اُس کی بیوی بنگلور ہی کی تھی۔ جس کے بطن سے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ اُس کی بیوی اردو زبان سے قطعاً ناآشنا تھی۔ اس لئے اُسے تنہائی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی، کبھی کبھی چھوٹی لڑکی آتی اور اپنی ماں کا پیغام ڈاکٹر کے کان میں ہولے سے پہنچا دیتی اور پھر دوڑتی مطب سے باہر نکل جاتی۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر سے میرا دوستانہ ہو گیا —— بڑا

بے تکلف قسم کا۔ اُس نے مجھے اپنی گذشتہ زندگی کے تمام حالات و واقعات سنائے۔ مگر وہ اتنے دل چسپ نہیں کہ اُن کا تذکرہ کیا جائے

اب میں نے باقاعدگی کے ساتھ اُن کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ میں بھی چونکہ بوتل کا رسیا تھا۔ اس لئے ہم دونوں کی گاڑھی چھننے لگی۔

ایک دو ماہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر سعید اُلجھا اُلجھا سا رہتا ہے۔ اپنے کام سے اُس کی دلچسپی دن بدن کم ہو رہی ہے ——— پہلے تو میں اُسے ٹٹولتا رہا، آخر میں نے صاف لفظوں میں اس سے پوچھا "یار سعید ——— تم آج کئی دن سے کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟"

ڈاکٹر سعید کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "نہیں تو!"

نہیں تو کیا ——— میں اتنا گدھا تو نہیں کہ اتنا بھی نہ پہچان سکوں کہ تم کسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار ہو ———"

ڈاکٹر سعید نے اپنا وِسکی کا گلاس اُٹھایا اور ہونٹوں تک لے جا کر کہا "محض تمہارا واہمہ ہے ——— یا تم اپنی نفسیات شناسی کا رعب

مجھ پر گانٹھنا چاہتے ہو۔"

میں نے ہتھیار ڈال دیئے ـــــ حالانکہ اس کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا، کہ اُس کے دل کا چور پکڑا جا چکا ہے۔ مگر اسے اپنی شکست کے اعتراف کا حوصلہ نہیں۔

بہت دن گذر گئے۔ اب وہ کئی کئی گھنٹے اپنے مطب سے غیر حاضر رہنے لگا۔ یہ جاننے میں کہ وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، اس کی ذہنی پریشانی کا باعث کیا ہے۔ میرے دل و دماغ میں بڑی کھُد بُد ہو رہی تھی۔ اب اتفاقاً اگر اُس سے ملاقات ہوتی، تو میرا بے اختیار جی چاہتا کہ اُس سے ایک بار پھر وہ سوالات کروں جن کے جواب سے میری ذہنی الجھن دُور ہو۔ اور ڈاکٹر سعید کے عقب میں جو کچھ بھی تھا، اُس کی صحیح تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجائے ـــــ مگر ایسا کوئی "تخلیئے" کا موقعہ نہ ملا۔

ایک دن شام کو جب میں اُس کے مطب میں داخل ہونے لگا تو اُس کے نوکر نے مجھے روکا۔ "صاحب ابھی اندر نہ جائیے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے ہیں۔"

"تو دیکھا کریں۔"

نوکر نے مؤدبانہ عرض کی۔ "صاحب ـــــ وہ ـــــ میرا مطلب

مریض عورت ہے۔"

"اوہ ـــــ کب تک فارغ ہو جائیں گے، اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

نوکر نے جواب دیا "جی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــ ایک گھنٹے سے وہ بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے ہیں۔"

میں تھوڑے توقف کے بعد مسکرایا "تو ـــــ تو مرض کوئی خاص مرض معلوم ہوتا ہے۔" اور یہ کہہ کر میں نے غیر ارادی طور پر ڈاکٹر سعید کے کمرۂ تشخیص کا دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

کیا دیکھتا ہوں، سعید ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ بیٹھا ہے، تپائی پر بیئر کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہیں، اور دونوں محوِ گفتگو ہیں۔ سعید اور وہ محترمہ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔

میں نے ازراہِ تکلف اُن سے معذرت طلب کی اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سعید پکارا "کہاں چلے ـــــ بیٹھو!"

میں نے سعید سے کہا "میری موجودگی شاید آپ کی گفتگو میں مخل ہو۔"

سعید نے اُٹھ کر مجھے کاندھوں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا "ہٹاؤ یار اِس تکلف کو۔"

پھر اُس نے ایک خالی گلاس میں میرے لئے بیئر اُنڈیلی اور اُسے میرے سامنے رکھ دیا۔ "لو پیو۔"

میں نے دو گھونٹ بھرے تو سعید نے اُس ادھیڑ عمر کی عورت سے جو لباس اور زیوروں سے کافی مالدار معلوم ہوتی تھی، تعارف کرایا۔ "سلمیٰ رحمانی ——— اور یہ میرے عزیز دوست سعادت حسن منٹو۔"

سلمیٰ رحمانی چند ساعتوں کے لئے مجھے بڑے غور اور تعجب سے دیکھتی رہی۔ "سعید ——— کیا واقعی، یہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ جن کے افسانوں کے سارے مجموعے میں بڑے غور سے ایک نہیں دو، دو، تین تین مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔"

ڈاکٹر سعید نے اپنا گلاس اٹھایا۔ "ہاں وہی ہیں ——— میں نے کئی مرتبہ خیال کیا کہ اس سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دوں، پر میں نے سوچا تم اس کے نام سے یقیناً واقف ہوگی ——— شیطان کو کون نہیں جانتا۔"

سلمیٰ رحمانی یہ سن کر پیٹ بھر کے ہنسی ——— اور اُس کا پیٹ عام پیٹوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔

اس کے بعد مِس سلمیٰ رحمانی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پڑھی لکھی

عورت تھی۔ بڑے اچھے گھرانے سے متعلق تھی۔ تفتیش کرنے کے بغیر مجھے اس کے متعلق چند معلومات حاصل ہوگئیں کہ وہ تین خاوندوں سے طلاق لے چکی ہے۔ صاحبِ اولاد ہے، جہاں رہتی ہے، اس میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک غسل خانہ ہے، وہاں اکیلی رہتی ہے۔ غیر منقولہ جائیداد سے اُس کی آمدن چار پانچ سو روپے ماہوار کے قریب ہے، ہیرے کی انگوٹھیاں پہنتی ہے۔

ان انگوٹھیوں میں سے ایک میں نے دوسرے روز شام کو سعید کی اُنگلی میں دیکھی۔

تیسرے روز شام کو ڈاکٹر سعید کے مطب میں سلمیٰ رحمانی موجود تھی دونوں بہت خوش تھے اور چہچہا رہے تھے ــــــ میں بھی ان کی بیر نوشی میں شریک ہوگیا۔

پچھلے ایک ہفتے سے میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر سعید کے اندر کمرۂ تشخیص سے کچھ دُور جو دو کمرے خالی پڑے رہتے ہیں ان کی بڑی توجہ سے مرمت کرائی جا رہی ہے۔ اُن کو سجایا بنایا جا رہا ہے۔ فرنیچر جب لایا گیا تو وہی تھا جو میں نے سلمیٰ رحمانی کے گھر دیکھا تھا۔

اتوار کو ڈاکٹر سعید کی چھٹی کا دن ہوتا تھا، کواڑ بند رہتے، تاکہ اس کو تنگ نہ کیا جائے ــــــ مجھے تو وہاں ہر وقت آنے جانے کی اجازت

تھی۔ ایک چور دروازہ تھا، اس کے ذریعے سے میں اندر پہنچا اور سیدھا اُن دو کمروں کا رُخ کیا، جن کی مرمت کرائی گئی تھی۔

دروازہ کھُلا تھا، میں اندر داخل ہُوا تو حسبِ توقع ڈاکٹر سعید کی بغل میں سلمیٰ رحمانی بیٹھی تھی۔ سعید نے مجھ سے کہا "میری بیوی سلمیٰ رحمانی سے ملو"

مجھے اس عورت سے کیا ملنا تھا۔ سینکڑوں بار مل چکا تھا، لیکن اگر کسی عورت کی چوتھویں شادی ہو تو اُس کو کن الفاظ میں مبارکباد دینی چاہیئے۔ اس کے بارے میں میری معلومات صِفر کے برابر تھیں سمجھ میں نہ آیا، کیا کہوں ——— لیکن کہنا بھی کچھ ضرور تھا ——— اس لئے جو منہ میں آیا باہر نکال دیا "تو آخر اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا"

میاں بیوی دونوں ہنسے۔ سعید نے مجھے بیٹھنے کو کہا، بیئر پیش کی۔ اور ہم شادی کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر دیر تک گفتگو ——— میں شام پانچ بجے آیا تھا۔ گھڑی دیکھی تو نو بجنے والے تھے۔ میں نے سعید سے کہا "لو بھئی ——— میں چلا ——— باتوں، باتوں میں اتنی دیر ہو گئی ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا"

سعید کے بجائے سلمیٰ رحمانی، معاف کیجئے گا سعید مجھ سے

مخاطب ہوئیں "وہ نہیں آپ نہیں جا سکتے ـــــ کھانا تیار ہے ـــــ
اگر آپ کہیں تو لگوا دیا جائے۔"
خیر، سعید اور اس کی نئی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے کھانا کھانا پڑا
جو بہت خوش ذائقہ اور لذیذ تھا۔
دو برس تک ان کی زندگی بڑی ہموار گذرتی رہی۔ ایک دن میں
ناسازئ طبیعت کے باعث بستر ہی میں لیٹا تھا کہ نوکر نے اطلاع دی،
"ڈاکٹر سعید صاحب تشریف لائے ہیں"
میں نے اس سے کہا۔ "جاؤ اُن کو اندر بھیج دو۔"
سعید آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مضطرب اور پریشان ہے
اس نے مجھے کچھ پوچھنے کی زحمت نہ دی اور اپنے آپ بتا دیا کہ سلمیٰ
سے اب اس کی ناچاقی شروع ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ وہ خودسر
عورت ہے۔ کسی کو نظر ہی میں نہیں لاتی۔ میں نے صرف اس لئے
اُس سے شادی کر لی کہ وہ اکیلی تھی۔ اُس کے عزیز و اقربا اُسے پوچھتے
ہی نہیں تھے ـــــ جب وہ بیمار ہوئی ـــــ اور یہ
کوئی معمولی بیماری نہیں تھی۔ ڈپتھیریا تھا جسے خناق کہتے ہیں، تو میں
نے اپنا تمام کام چھوڑ کر اس کا علاج کیا اور خدا کے فضل و کرم سے
وہ تندرست ہو گئی ـــــ پر اب وہ ان تمام باتوں کو پسِ پشت

ڈال کر مجھ سے کچھ اس قسم کا سلوک کرتی ہے جو بے حد ناروا ہے۔
تو آغاز کا انجام شروع ہو گیا تھا۔
چونکہ ڈاکٹر سعید کا گھر میرے گھر کے بالکل پاس تھا۔ اس لئے اُن کی لڑائیوں کی اطلاعات ہمیں مختلف ذریعوں سے پہنچتی رہتی تھیں۔
سلمیٰ کے ساتھ دو نوکرانیاں تھیں، بڑی تیز طرّار اور ہٹّی کٹّی ——— ان دونوں کے شوہر تھے، وہ ایک طرح اس کے ملازم تھے۔ اُس کے اشارے پر جان دے دینے والے، اور ڈاکٹر سعید بڑا مختصر اور نحیف مرد۔
ایک دن معلوم ہُوا کہ ڈاکٹر سعید اور سلمیٰ نے پی رکھی تھی کہ آپس میں دونوں کی چخ ہو گئی ——— ڈاکٹر نے معلوم نہیں لنتے ہیں کیا کہہ دیا کہ سلمیٰ آگ بگولا ہو گئی۔ اُس نے اپنی دونوں نوکرانیوں کو آواز دی، وہ دوڑی دوڑی اندر آئیں۔ سلمیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کر دی جائے ——— ایسی مرمت کی کہ ساری عمر یاد رکھے۔
یہ حکم ملنا تھا کہ ڈاکٹر سعید کی مرمت شروع ہو گئی۔ دونوں نوکرانیوں نے اپنے شوہروں کو بھی اسی سلسلے میں شامل کر لیا، لاٹھیوں اور گھونسوں اور دوسرے تھرڈ ڈگری طریقوں سے اُسے خوب مارا پیٹا گیا کہ اس کا کچومر نکل گیا۔
افتاں و خیزاں بھاگا وہاں سے اور اوپر اپنی پرانی بیوی کے پاس پہنچ گیا

جس نے ایک مستعد نرس کی طرح اُس کی خدمت شروع کردی۔

اس کے بعد یہ ہُوا کہ اس نے دو کمروں کا رُخ قریب قریب دو ماہ تک نہ کیا۔ اب وہ سلمیٰ سے کسی قسم کا رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہوگیا سو ہوگیا ——— اب اس کو اپنے گھر سے بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسے یہ محسوس ہوتا کہ یہ عورت جس سے ہیں نے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ کیوں ابھی تک اُس کے سر پہ مسلط ہے ——— اُس کے گھر سے چلی کیوں نہیں جاتی، مگر وہ اُس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک دو ماہ اور گذر گئے، پر اس دوران ہیں ڈاکٹر سعید کو معلوم ہوچکا تھا کہ اُس کا یُو۔پی کے ایک تاجر سے معاشقہ چل رہا ہے یہ شخص صرف نام ہی کا تاجر تھا۔ اس کے پاس کوئی دولت نہیں تھی، صرف ایک مکان تھا۔ جو اس نے ہجرت کرنے کے بعد اپنے نام الاٹ کرالیا تھا

"دونوں ہر روز شام کو میرے یہاں آتے ——— شعر و شراب کی محفلیں جمتیں ——— اور میرے سینے پر مونگ دلتی رہتیں۔"

ایک دن اُس سے یہ کہے بغیر نہ رہا جاسکا۔

میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے کہا۔ "اوّل تو تم نے یہ غلطی کی کہ سلمیٰ سے شادی ـــــــ دوسری غلطی، تم یہ کر رہے ہو کہ اُسے اپنے گھر سے باہر نہیں کرتے ـــــــ کیا یہ اُس کے باپ کا گھر ہے؟"

ڈاکٹر سعید کی گردن شرمساری کے باعث جھک گئی "یار، چھوڑ دو اس قصّے کو"

"قصّے کو تو تم اور میں دونوں چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن یہ قصّہ ہی تمہیں نہیں چھوڑتا اور چھوڑے گا۔ جبکہ تم کوئی مردانہ وار کوشش نہیں کرتے"

وہ خاموش رہا ـــــــ میں نے اُس پر ایک گولہ اور پھینکا "سچ پُوچھو تو سعید تم نامرد ہو ـــــــ میں تمہاری جگہ ہوتا تو محترمہ کا قیمہ بنا ڈالتا ـــــــ اصل میں تم ضرورت سے زیادہ شریف ہو"

سعید نے نقاہت بھری آواز میں صرف اتنا کہا "میں بہت خطرناک مجرم بھی بن سکتا ہوں ـــــــ تم نہیں جانتے"

میں نے طنزاً کہا "سب جانتا ہوں ـــــــ اُس سے اتنی مار کھائی، اتنے ذلیل ہوئے ـــــــ میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ محترمہ تمہارے گھر سے جاتی کیوں نہیں؟ ـــــــ اس پر اب اُس

کا کیا حساب ہے۔"

سعید نے جواب دیا۔" وہ چلی گئی ہے ——— اور اس کا سامان بھی۔ بلکہ میرا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔"

میں بہت خوش ہوا۔ لعنت بھیجو اپنے سامان پر ——— چلی گئی ہے۔ بس ٹھیک ہے ——— تم خوش، تمہارا خدا خوش ———

چلو۔ اسی خوشی میں وہ دو بیئر کی یخ بستہ بوتلیں پئیں جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں ——— اس کے بعد کھانا کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔

سلمیٰ کے جانے کے بعد ڈاکٹر سعید کم از کم ایک ماہ تک کھویا کھویا سا رہا ——— اس کے بعد وہ اپنی نورمل حالت میں آگیا۔ ہر شام اس سے ملاقات ہوتی۔ گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور ہنسی مذاق کرتے رہتے۔

کچھ دنوں سے میری طبیعت موسم کی تبدیلی کے باعث بہت مضمحل تھی۔ بستر میں لیٹا تھا کہ ڈاکٹر سعید کا ملازم آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں اور بلا رہے ہیں۔ ایک ضروری کام ہے۔

میرا جی تو نہیں چاہتا تھا، بستر پر سے اُٹھنے کو ——— مگر میں سعید کو نا امید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے شیروانی پہن کر اس

کے یہاں پہنچا۔ مکان کے باہر دیکھا کہ چار دیگیں چڑھی ہیں ———
قصائی وھڑا دھڑ بوٹیاں کاٹ کاٹ کر صف کے ایک ٹکڑے پر پھینکے چلا
جا رہا ہے۔

آس پاس کے کئی آدمی جمع تھے، میں سمجھا شاید کوئی نذر نیاز دی
جا رہی ہے ——— میں نے گوشت کا وہ بڑا لوتھڑا دیکھا جس پر
کلہاڑی چلائی جا رہی تھی ——— اس کیساتھ دو باہیں تھیں ———
بالکل انسانوں کے مانند ——— میں نے پھر غور سے دیکھا ———
قطعی طور پر انسانی باہیں تھیں۔ سمجھ میں نہ آیا، یہ قصّہ کیا ہے۔

قصائی کی چھری اور کلہاڑی چل رہی تھی۔ چار دیگوں میں پیاز سرخ کی
جا رہی تھی اور میرا دل و دماغ ان دونوں کے درمیان پھنستا اور دھنستا چلا جا رہا
تھا۔ کہ ڈاکٹر سعید نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی پکارا "آیئے ———
آیئے ——— آپ کے کہنے کے مطابق قیمہ تو نہ بن سکا۔ مگر یہ بوٹیاں
تیار کرائی گئی ہیں ——— ابھی اچھی طرح بھونی نہیں گئیں، ورنہ میں آپ
کو ایک بوٹی پیش کرتا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مرچ مصالحہ ٹھیک ہے یا نہیں!"
یہ سُن کر پہلے مجھے متلی آئی ——— اور میں بیہوش ہو گیا۔

ختم شد

(لاہور پریس دہلی)